یہ ہنستا ہوا موسم

فرحت اشتیاق

یہ ہنستا ہوا موسم

تقریباً ایک سال کی انتھک اور جان توڑ محنت کے بعد وہ اپنے پسندیدہ پرچے میں اپنی کہانی شائع کروانے میں کامیاب ہوئی تھی۔

سمسٹر بریک کی وجہ سے وہ، ناجیہ اور افشاں پھوپھی صاحب کے ساتھ حیدر آباد گئی ہوئی تھیں جب اسے خوشی کی یہ خبر ملی۔ اسے کوئی بھی کام کرنے کا اچانک جنون سوار ہوتا تھا۔ یہ اور بات کہ وہ جنون ہمیشہ کڑھی کا ابال ثابت ہوتا تھا۔ میٹرک کے بعد سے اس جنون نے مزید ترقی کر لی تھی۔ کبھی اسے لگتا کہ میں شاعری بہت اچھی کر سکتی ہوں اور بس پھر سب چھوڑ چھاڑ دھڑا دھڑ شاعری کی ٹانگ توڑنے کی کوششیں شروع ہو جاتیں۔ زیادہ تر آزاد نظمیں کہی جاتیں کہ ان میں قافیہ، ردیف اور وزن بے وزن وغیرہ کا اتنا زیادہ مسئلہ نہیں ہوتا۔ انجم باجی کے منگیتر نے امریکہ جا کر کسی ہسپانوی سے شادی کر لی تو ان کے منگیتر کی بے وفائی اور ان کے زارو قطار رونے سے متاثر ہو کر اس نے فوراً ہی یہ شعر کہا۔

وہ اگر کبھی لوٹ آئے تو پوچھنا اے صبا
جھوٹا وعدہ کر کے کیا مل گیا تجھے

اور اس شعر پر فاروق اور خرم نے دل کھول کر اس کا مذاق اڑایا تھا۔

”شعر میں بھی اپنی کام چوری ثابت کر دی نا۔ سب کام صبا کرے، خود کچھ مت کرنا۔“

فاروق کہنے کو عمر میں اس سے ایک سال چھوٹا مگر بدتمیزی اور دل جلانے میں کئی سال بڑا تھا۔ آپی، باجی تو وہ تھی ہی نہیں، دھڑلے سے اس کا نام لیا جاتا اور اسی کی دیکھا دیکھی خرم نے بھی پر پرزے نکال لیے تھے۔ ان ہی لوگوں کے مذاق سے بددل ہو کر اس نے شاعری چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ اس کا انٹرسٹ فوٹوگرافی میں پیدا ہو گیا۔ پاپا کا یاشیکا اور بھائی میاں کا Canon گلے میں لٹکائے اس نے کتنی ہی حسین و دلفریب تصاویر کھینچیں۔

ناجیہ تو اس کے ہر شوق میں ساتھ ساتھ ہوتی ہی تھی۔ دونوں منہ اندھیرے بستر سے اٹھ بیٹھتیں اور سورج طلوع ہوتے وقت کی تصویر کھینچنے کے لیے آفتاب کا انتظار شروع کر دیتیں۔ اتنی محنت اور جدوجہد کے بعد جب بھی وہ کسی تصویری مقابلے میں اپنی تصاویر بھجواتی، انعام ملنا تو درکنار اس کی تصویر مقابلے کے لیے منتخب ہی نہ ہو پاتی اور نتیجتاً وہ فاروق، خرم اور افشاں کے مذاق کا نشانہ بنتی۔

حسرت ان غنچوں پہ جو بن کھلے مرجھا گئے

فاروق بڑی دکھ بھری شکل بنا کر کہتا تو اس کا غم و غصے سے برا حال ہو جاتا۔

اس شوق کو بھی گردشِ دوراں نے پنپنے نہ دیا تو وہ پینٹنگ کی طرف متوجہ ہوئی۔ تب وہ انٹر کر چکی تھی اور آنرز میں کون سا مضمون لیا جائے

اس مسئلے پر غوروفکر کر رہی تھی۔ اسے اچانک ہی یہ احساس ہوا تھا کہ اس میں پیدائشی طور پر ایک آرٹسٹ چھپا ہوا ہے۔ بس صرف اور صرف اپنے اس ٹیلنٹ کو دنیا والوں کے سامنے لانے کی دیر ہے، پھر صادقین، مائیکل انجلو، چغتائی، لیونارڈو ونچی اور شاکر علی وغیرہ تو اس کے آگے پانی بھرتے نظر آئیں گے۔ جب اپنی اس خوبی کا ادراک ہوا تو وہ اور ناجیہ ایک مرتبہ پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔ اس فیلڈ کی بھی تو اتنی ساری جہتیں ہیں۔ خطاطی کرنی ہے، تجریدی آرٹ کی طرف جانا ہے، ریلسٹک اسلوب میں پینٹنگ کرنی ہے۔ واٹر کلر استعمال کرنا اور آئل پینٹنگ کرنی ہے۔ وہ دونوں کافی دنوں تک اس مسئلے میں الجھی رہیں۔ پھر ناجیہ ہی کی ایک دوست کے توسط سے وہ ایک مایہ ناز مصور کے ہاں پہنچی جو باقاعدہ اپنے گھر میں نوجوان آرٹسٹوں کو پینٹنگ سکھایا کرتے تھے۔

''سنا ہے یہ آرٹسٹ وغیرہ پیتے پلاتے بھی ہیں۔''

فلک نے اپنی سنی سنائی اکیلے میں ناجیہ کے سامنے دہرائی تو وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''آہستہ بولو، اگر امی نے سن لیا تو جا چکے ہم وہاں۔ اور وہ کیا پیتے ہیں اور کیا کھاتے ہیں ہمیں اس سے کیا، تمہیں کوئی رشتے داری جوڑنی ہے۔''

ناجیہ کے ڈپٹنے پر وہ چپ ہو گئی تھی۔ ناجیہ کی دوستوں کے ساتھ ہی وہ لوگ وہاں گئی تھیں۔ ایک گھنٹہ ان لوگوں کو انتظار میں سکھا کر آخر کار وہ جلوہ افروز ہوئے تھے۔ آتے ہی انہوں نے بڑے خشک اور پروفیشنل انداز میں اس کے ہاتھ میں ایک پیپر اور پنسل پکڑا کر سامنے رکھی کرسی بنانے کے لیے کہا تھا۔ دس منٹ کی کوششوں کے بعد اس نے کرسی بنا کر ان کی خدمت میں پیش کی تو انہوں نے اس پر ایک نگاہ ڈال کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''پیسے کمانا میرا مقصد نہیں ہے۔ میں پیدائشی آرٹسٹوں کے فن کو نکھارنے کا کام کرتا ہوں۔ یہ کوئی دو اور دو چار والا کام نہیں، نہ میں فارمولا رٹوا دوں اور آپ آرٹسٹ بن جائیں۔ آپ سے تو لائن تک سیدھی نہیں کھینچی گئی ہے، آپ پینٹنگ کیا کریں گی۔''

بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

کے مصداق وہ برے برے منہ بناتی وہاں سے نکل آئی تھی۔

''اس دنیا میں فن کی قدر ہی نہیں ہے۔'' اس نے دکھی دل سے سوچا تھا۔ لائن سیدھی نہیں کھینچی یہ بھی کوئی بات ہے۔ وہ دونوں اس غم میں گھلی جا رہی تھیں۔ ناجیہ نے اسے پھر تجریدی آرٹ کی طرف توجہ دلائی تھی۔

''جیسے دل چاہے الٹی سیدھی لکیریں ڈال کر رنگ بھر دینا۔ میں نے تجریدی آرٹ کے آج تک جتنے بھی نمونے دیکھے ہیں وہ ایسے ہی لگتے ہیں جیسے کسی بچے کے ہاتھ میں پینٹ برش تھما کر کہہ دیا گیا ہو، کھیلو بیٹا! یا پھر بطخ کے پیروں پر مختلف رنگوں کا پینٹ لگا کر اسے پینٹنگ پر سے گزار دیا گیا ہو۔''

مگر اس کا دل اتنی بری طرح ٹوٹا تھا کہ پھر اس نے مڑ کر بھی فن مصوری کی طرف نہیں دیکھا اور سیدھا سیدھا اچھے بچوں کی طرح کراچی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ وہ لوگ حیدر آباد میں رہتے تھے۔ ناجیہ کو کراچی یونیورسٹی میں پڑھنے کا شوق تھا اور پاپا اور پھوپھی صاحب کے پیچھے لگ کر وہ کراچی جا کر پڑھنے کی اجازت حاصل کر چکی تھی۔ پاپا خود آئی بی اے کے پڑھے ہوئے تھے اور انہیں کراچی یونیورسٹی بالخصوص آئی بی اے کا

معیارِ تعلیم بے حد پسند تھا۔ اسی وجہ سے پھوپھی صاحب اور مما کے اعتراضات کو یکسر رد کرتے ہوئے انہوں نے ناجیہ اور فلک کو کراچی میں پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ ناجیہ ایڈمیشن لے اور فلک نہ لے، ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ ویسے بھی ان دنوں اپنی ناقدری کا غم منا رہی تھی۔ یوں ناجیہ اور اس نے ایک ساتھ ایڈمیشن کے لیے اپلائی کر دیا تھا۔

جامعہ کراچی میں آنرز میں داخلے کے لیے انگلش ان کی پہلی چوائس تھی اور خوبیٔ قسمت سے ان دونوں ہی کو وہاں داخلہ مل گیا تھا۔ ناجیہ کو ہاسٹل میں رہنے کا شوق تھا مگر جس طرح بے چارے ''پطرس'' کو ان کے والدین نے ہوسٹل میں نہیں رہنے دیا تھا اور ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک عدد ماموں جان دریافت کر کے ان کے گھر بھجوا دیا تھا بالکل اسی طرح ناجیہ اور فلک کو بھی ہوسٹل میں رہنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ بس فرق صرف یہ تھا کہ انہیں کسی رشتے دار کے گھر رہنے پر مجبور نہیں کیا گیا تھا بلکہ کلفٹن میں پاپا نے جو فلیٹ خریدا ہوا تھا اور عنقریب اسے کرائے پر چڑھانے کا ارادہ رکھتے تھے وہاں ان لوگوں کی رہائش کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔ یہ دونوں ہی اس بات پر بہت تلملائی تھیں۔ ہوسٹل کی لائف کا اپنا ہی چارم ہوتا ہے۔ پھر وہاں کے رنگ برنگے قصے سن سن کر ان لوگوں کا شوق تو پہلے ہی عروج پر پہنچا ہوا تھا مگر پاپا کے حکم سے سرتابی کی مجال کس میں تھی۔ یوں فلک اور ناجیہ پھوپھی صاحب کے ساتھ کراچی آ گئی تھیں۔

پھوپھی صاحب شادی کے سات سال بعد ہی بیوہ ہو گئی تھیں اور تب ہی سے وہ ان لوگوں کے پاس آ گئی تھیں۔ سب سے بڑی اسماء آپی کی انہوں نے بی اے کرتے ہی شادی کر دی تھی۔ اس کے بعد ناجیہ تھی جو فلک کی ہی ہم عمر تھی اور سب سے چھوٹا خرم جو فاروق سے ایک سال چھوٹا تھا۔ پاپا نے اپنے بچوں اور بہن کے بچوں میں کبھی فرق نہیں رکھا تھا۔ جس طرح بھائی میاں، فلک، افشاں اور فاروق انہیں عزیز تھے بالکل اسی طرح اسماء آپی، ناجیہ اور خرم بھی انہیں پیارے تھے۔ مما اور پھوپھی صاحب میں نند بھاوج والے روایتی تعلقات تو نہیں تھے مگر کبھی کبھار تو تو میں میں ہو ہی جایا کرتی تھی مگر یہ تکرار صرف ان ہی دونوں تک محدود رہتی تھی، وہ لوگ کبھی بھی اس جھگڑے میں فریق نہیں بنے تھے۔

ان لوگوں کے ساتھ پاپا نے گھر میں فالتو کھڑی سوزوکی مہران بھی کراچی بھجوا دی تھی تاکہ ان لوگوں کو یونیورسٹی آنے جانے میں دقت نہ ہو۔ پھوپھی صاحب صبح خود ان لوگوں کو چھوڑتیں اور واپسی میں لینے بھی خود آتیں۔ ان دونوں کی ڈرائیونگ پر تو انہیں ہرگز بھروسا نہیں تھا۔

یونیورسٹی میں جلد ہی ان لوگوں کی بہت سی دوست بن گئی تھیں۔ ہائے ہیلو تو سب ہی سے تھی مگر زیادہ افرحہ، یمینہ، سعدیہ، عروس اور فاطمہ سے تھی۔ یوں ان کا سات لڑکیوں کا گروپ تھا۔ ان لوگوں کے تمام شوق اور دلچسپیاں ایک سی تھیں۔

حیدر لوگوں کے گروپ کے ساتھ ان لوگوں کی شروع سے نہیں بنی تھی۔ پہلی اختلافی بات یہ ہوئی تھی کہ وہ لوگ ان کی سیٹوں پر بیٹھ گئے تھے۔ فلک کا موقف یہ تھا کہ پہلے روز جو جس سیٹ پر بیٹھ گیا وہ اس کی ہوئی مگر وہ بجائے وہاں سے اٹھنے کے بحث کرنے کھڑے ہو گئے تھے اور یوں ان کے گروپ کے ساتھ فلک کی خاص طور پر ان بن ہو گئی تھی۔ ان کے گروپ میں چار لڑکے اور دو لڑکیاں شامل تھیں۔

وقت کچھ اور آگے بڑھا۔ وہ لوگ فرسٹ سمسٹر سے تھرڈ سمسٹر میں آ گئے۔ اس دوران ان کی دشمنی میں بھی مزید اضافہ ہی ہوا تھا۔ یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹس ویک منایا گیا تو ان کے ڈرامے کی پروفیسر نے آنرز اور ماسٹرز کے تمام اسٹوڈنٹس کے درمیان ڈرامہ لکھنے کا مقابلہ کروایا۔'' جس کا

ڈرامہ سب سے اچھا اور معیاری ہو وہ اسٹوڈنٹس ویک میں ڈرامے والے دن اسٹیج کیا جائے گا۔'' انہوں نے کہا تھا۔

وہ امریکہ سے پی ایچ ڈی کر کے آئی تھیں اور وہاں کا طریقہ تعلیم یہاں اپلائی کرنے کی کوششوں میں مصروف تھیں۔

''میں ٹیلنٹ ہنٹنگ کر رہی ہوں۔ اس طرح ہمارے طالب علموں کی پوشیدہ صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں گی۔ کیا پتا ان ہی میں کوئی شیکسپیئر چھپا ہوا ہو، بس بات تو صرف اسے تلاش کرنے کی ہے۔

انہوں نے انگلش ڈپارٹمنٹ کی ہر کلاس میں جا کر یہی کہا تھا۔ ان کی بات سن کر فلک کو اچانک محسوس ہوا کہ وہ اپنی اب تک کی زندگی بے کار مشاغل میں ضائع کرتی رہی ہے۔ اسے تو دراصل ایک رائٹر بننا تھا۔ یہی بات اس نے اپنی فرینڈز کے گوش گزار کی تو وہ سب بھی پر جوش انداز میں اس آئیڈیے کی حمایت کرنے لگیں۔ حیدر کے گروپ میں سے امیر حمزہ ڈرامہ لکھ رہا تھا۔ وہ ان کے گروپ کا ہونہار ممبر تھا اور مختلف اخبارات و جرائد میں پابندی سے لکھتا بھی تھا۔

لکھنے کا سوچ تو لیا تھا مگر لکھیں کس موضوع پر یہ بات خاصی پریشان کن تھی۔ وہ سب کی سب روزانہ ان کے ساتھ گھر آجاتیں اور سر جوڑ کر خوب صلاح مشورے ہوتے مگر کسی ایک موضوع پر اتفاق رائے نہ ہو پاتا۔ ڈرامہ ڈاکٹر شاہینہ کے پاس جمع کروانے کی آخری تاریخ سر پر آگئی تو وہ بالکل بوکھلا گئیں۔ اچانک ہی افرحہ کو ایک انوکھا خیال سوجھا۔

''کیوں نہ ہم کسی انگلش ناول کی تھیم چرا لیں، زیادہ محنت بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ تھوڑا سا اسے اپنے ہاں کے مشرقی ماحول کے مطابق ڈھال لیں گے اور ہیرو ہیروئن کے نام مسلمانوں والے رکھ دیں گے، اللہ اللہ خیر صلا۔''

اس کا ذہانت سے بھر پور آئیڈیا پسند تو سب ہی کو آیا تھا مگر یہ بھی پتا تھا کہ اگر پکڑے گئے تو ڈاکٹر شاہینہ پھر جیسا سلوک کریں گی وہ عزت دار آدمی کے لیے موت سے پہلے موت ہوگی۔

''بھئی وہ کتنی بھی پڑھی لکھی اور جینیئس سہی پر انہوں نے سارا کا سارا انگلش لٹریچر تھوڑی ہضم کر رکھا ہوگا۔ ہم کسی غیر معروف رائٹر کا غیر معروف ناول تلاش کریں گے جس کے بارے میں کبھی کسی سے نہ سنا ہو اور یہ بات تو بھول ہی جاؤ کہ کوئی اسٹوڈنٹ ہماری اس حرکت کو پکڑ پائے گا۔ یہ نوٹس رٹنے اور Presecribed books بمشکل پڑھنے والے اسٹوڈنٹس اتنے پڑھا کو نہیں ہو سکتے کہ انہوں نے کسی بالکل ہی غیر معروف رائٹر کو پڑھ رکھا ہو۔ ہم کوئی شیکسپیئر، برنارڈ شا یا ٹالسٹائی کو کاپی کرنے تھوڑی جا رہے ہیں جو کوئی پکڑ لے گا۔''

ناجیہ نے بھی افرحہ کی حمایت کی تو وہ سب ہی اس مشن پر ڈٹ گئیں۔

اردو بازار اس مقصد کے لیے بہترین جگہ تھی۔ وہ سب با جماعت وہاں پہنچیں اور کافی غور و فکر کرنے کے بعد ایک بالکل ہی غیر معروف نام والے رائٹر کی کتاب خرید لی۔ اس رائٹر کا نہ کبھی نام کہیں سنا تھا اور نہ پڑھا تھا۔ اس کتاب میں پانچ کہانیاں تھیں۔ گھر آکر ان لوگوں نے بغور اس کتاب کا تفصیلی مطالعہ کیا تھا اور اس میں سے ایک کہانی جس میں شوہر اپنی بیوی کو کسی ان جانے قاتل سے بچانے کے لیے پولیس اور سیکرٹ سروس والوں کی مدد لے رہا ہوتا ہے مگر آخری صفحے پر جا کر پتا چلتا ہے کہ وہ خود ہی بیوی کو قتل کرنے والا تھا ان لوگوں نے پسند کی۔ اس کہانی میں تھرل، سسپنس،

عورت ذات کی مظلومیت، مردوں کی بے وفائی یعنی تمام لوازمات موجود تھے۔ اس لیے وہ لوگ اس موضوع سے سو فیصد مطمئن تھیں۔

پھر تین دن تک دن و رات لگ کر فلک نے ڈرامہ لکھا۔ اس دوران ناجیہ تو اس کے ساتھ تھی ہی مگر وہ پانچوں بھی ان ہی کے ہاں رہ رہی تھیں۔ عروسہ نے تو کلاس میں بانگِ دہل کہہ بھی دیا تھا کہ فلک کے علاوہ کسی اور کا ڈرامہ منتخب ہونے والا نہیں ہے۔ اس لیے باقی لوگ بلا مقابلہ ہی شکست تسلیم کر کے ممکنہ ذلت و رسوائی سے بچ جائیں۔ اس کے لکھے ہوئے ایک ایک صفحے کا وہ سب کی سب تفصیلی پوسٹ مارٹم کرتیں اور سب کے صلاح مشورے سے فیض یاب ہوتی۔ آخر کار وہ آخری ڈیٹ سے ایک روز پہلے ڈرامے کا اسکرپٹ جمع کروانے میں کامیاب ہوئی تھی مگر جب نتائج کا اعلان ہوا اور پورے انگلش ڈپارٹمنٹ میں سے امیر حمزہ کا ڈرامہ بہترین قرار دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ اسٹوڈنٹس ویک کے لیے منتخب بھی کر لیا گیا تو اس کا دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہا۔

''کتنی محنت کی تھی میں نے اور فائدہ کیا ہوا۔ مجھ سے اچھا تو وہ حمزہ ہی ہے، کتنے آرام سے بیٹھے بٹھائے پرائز جیت لیا۔''

وہ زور و شور سے روتے ہوئے بولی تھی اور اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے وہ سب بھی رونے والی شکلیں بنا کر بیٹھ گئی تھیں۔

''جی ہاں، کافی محنت کی تھی آپ نے۔ پہلے اردو بازار گئیں، وہ بھی اتنی گرمی میں، پھر وہاں پندرہ بیس دکانوں اور آٹھ دس ردی والوں کے پاس سروے کر کے کتاب منتخب کی پھر اس کے بعد اس کتاب میں سے کہانی منتخب کی گئی اور اس کے بعد اسے پاکستانی ماحول میں ڈھال کر جوزفین اور ڈیوڈ کی جگہ شبو اور راجو کی کہانی بنایا گیا۔ کم سے کم آپ کی اس محنت کے صدقے ہی میں انہیں آپ کو انعام کا حقدار قرار دینا چاہیے تھا۔''

افشاں جو دور بیٹھی چپس اور پیپسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اس کے پندرہویں دفعہ ''اتنی محنت کی تھی میں نے'' کہنے پر جل کر بولی تھی۔ اپنی دوستوں کے سامنے بہن کی اس فضول بکواس پر اسے سخت غصہ آیا تھا۔ وہ ہمیشہ اسی طرح اس کا دل توڑا کرتی تھی۔ وہ فلک سے تین سال چھوٹی تھی اور اس کا ذاتی خیال تھا کہ وہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ میچور اور ذہین ہے۔ اس نے ہمیشہ اس کے ہر شوق پر اسی طرح اس کی دل شکنی کی تھی۔ وہ انڈس ویلی اسکول کے آرکیٹکچر ڈپارٹمنٹ کی ذہین طالبہ تھی۔ اس کا B.Arch کا پہلا سال تھا۔ فلک اور ناجیہ کی دیکھا دیکھی وہ بھی کراچی آ گئی تھی۔

حیدر کا گروپ تو اس کامیابی پر آپے سے باہر ہی ہو گیا تھا۔ وہ کلاس میں داخل ہوتی تو ''روتے ہیں چھم چھم نین'' کی آواز سنائی دیتی۔

سعدیہ اور فاطمہ لڑائی جھگڑے سے ڈرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں، اور ایسے موقع پر وہی اسے بازو سے دبوچ کر کلاس سے باہر لے جاتی تھیں۔ امیر حمزہ جس کا ڈرامہ منتخب ہوا تھا وہ اتنی چھچھوری حرکتیں نہیں کر رہا تھا جتنی اس کے باقی گروپ ممبرز۔ پھر جب اس کا لکھا ڈرامہ اسٹیج پر پیش کیا گیا تو موضوع کی انفرادیت اور معاشرے کے دوغلے نظام اور دوہرے طرزِ فکر پر جس بولڈ انداز میں اس نے لکھا تھا اس پر سب ہی نے اس پر تعریفوں کے ٹوکرے برسائے تھے۔ وہ لوگ بھی آڈیٹوریم میں افسردہ شکلیں بنا کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین اور وی سی نے امیر حمزہ کو تعریفی سرٹیفکیٹس کے علاوہ نقد انعام بھی دیا تھا۔ مختلف میگزینز میں تو وہ پہلے بھی لکھا ہی کرتا تھا اور انگلش ڈیپارٹمنٹ میں پہچانا بھی جاتا تھا مگر اب جس طرح اس کو اچانک ہی بے تحاشا شہرت اور پذیرائی ملی تھی وہ یقیناً اسی ڈرامے کی وجہ سے تھی۔

فلک کتنی بار حسرت سے سوچتی۔ یہ مقبولیت اور عزت مجھے بھی مل سکتی تھی اگر جو میرا ڈرامہ منتخب ہو جاتا۔ اب امیر حمزہ کو دوسرے ڈیپارٹمنٹس کے اسٹوڈنٹس بھی پہچاننے لگے تھے۔ اس کے لکھے آرٹیکلز پر ان کے ٹیچرز تک کمنٹس دیا کرتے تھے اور وہ ساتوں کی ساتوں جل بھن کر رہ جاتی تھیں۔ پڑھائی میں وہ سب کی سب اچھی تھیں۔ گو پوزیشن تو ان کے گروپ میں صرف اور صرف افرحہ ہی کی آتی تھی مگر باقی سب بھی فرسٹ ڈویژن سے نیچے کبھی نہیں گئی تھیں۔

حیدر کے گروپ سے پیچھے رہ جانے پر ان کے دل بے حد اداس تھے۔ ناجیہ وغیرہ نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ یونیورسٹی کے میگزین کے لیے کوئی آرٹیکل لکھے اور تب اچانک ہی اس کے ذہن میں آئیڈیا آیا تھا کہ آرٹیکل وغیرہ تو وہ نہیں لکھ سکتی لیکن کہانی نویسی میں اگر وہ چاہے تو اپنے آپ کو منوا سکتی ہے۔

''میرا خیال ہے میں بنیادی طور پر ایک ناول نگار ہوں اور مجھے اسی فیلڈ میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہیے۔''

افشاں جو وہیں ڈرائنگ بورڈ پر اپنی ڈرائنگ پھیلائے کام میں مصروف تھی اس کے جملے پر بے اختیار ہنس پڑی تھی جبکہ ناجیہ نے حسب سابق اس کی حمایت کی تھی۔ وہ سب ڈائجسٹ پڑھنے کی شوقین تھیں اور اکثر سلسلے وار ناولوں کے اوپر ان لوگوں کی باقاعدہ آپس میں شرط بھی لگا کرتی تھی کہ فلاں کریکٹر فلاں کا بھائی ہوگا یا فلاں کی شادی فلاں سے ہوگی۔ اب جو کہانی لکھنے کا خیال آیا تو اس نے فوراً ہی اس پر عمل پیرا ہونے میں دیر نہیں لگائی۔ ان کا پورا گروپ اس موقع پر بھی اس کی مدد کے لیے موجود تھا۔

''اچھا ہے، تمہاری کہانی چھپ جائے تو کم سے کم حیدر کے گروپ کی اتراہٹ تو کم ہوگی اور وہ امیر حمزہ صرف انگلش ڈیپارٹمنٹ میں سے منتخب ہوئے تھے جبکہ ہماری فلک بے شمار نامی گرامی رائٹرز کے ساتھ رسالے میں جگہ پائے گی۔ ایک سے ایک مشہور اور بڑی رائٹر کی تحریر چھپتی ہے اس ڈائجسٹ میں اور ان کے درمیان ہماری فلک کا نام بھی جگمگایا کرے گا۔'' یمینہ کا جوش کے مارے برا حال تھا۔

''بس کوئی اچھی سی تھیم مل جائے، باقی تو پھر میں لکھ لوں گی۔''

وہ ہر روز دوستوں کے پوچھنے پر کہ ''کچھ لکھا'' یہی جواب دیتی۔ تھک ہار کر پھر تھیم کے لیے انگلش ناولز کا سہارا لیا گیا۔ ہیرو، ہیروئن کے ناموں پر ان سب کے درمیان طویل میٹنگ ہوئی تھی۔ مختلف اسلامی ناموں والی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد نام فائنل ہوئے تھے۔ دس روز کی مسلسل محنت کے بعد کہانی مکمل ہوئی تھی۔

''ایسا کرو اپنا نام خالی ''فلک ناز'' لکھ دو۔'' ناجیہ نے سنجیدگی سے مشورہ دیا تھا۔ سب ہی کو پتا تھا اسے اپنے پورے نام ''شہزادی فلک ناز'' سے سخت چڑ تھی۔ مما، پاپا نے باقی بہن بھائیوں کے اتنے معقول اور مناسب نام رکھے تھے، پتا نہیں اس سے انہوں نے کون سے جنم کا بدلہ لیا تھا۔ اپنے نام کے آگے لگے اس شہزادی کی وجہ سے اسے شروع ہی سے اپنے کلاس فیلوز کے مذاق کا نشانہ بننا پڑا تھا۔

''کاش انسان اپنا نام خود بھی رکھ سکتا۔'' وہ اکثر بڑے دکھ سے سوچا کرتی تھی۔ نائنتھ کلاس میں آکر اس نے اپنے نام کے آگے سے شہزادی ہٹانا چاہا تھا مگر پھوپھی صاحب اور پاپا نے اس کی ایک نہیں چلنے دی تھی۔

''تمہاری دادی نے کتنے پیارے تمہارا نام رکھا تھا شہزادی فلک ناز اور تم دادی کا رکھا ہوا نام تبدیل کروگی۔ حد ہے بدتمیزی کی۔''

اور وہ خون کے گھونٹ پی کر چپ ہوگئی تھی۔ دادی کو شہزادی لگنے والی ضروری نہیں تھا کہ دوسروں کو بھی شہزادی نظر آتی اسی لیے اس کی خوب گت بنتی، خصوصاً یونیورسٹی آکر تو اس حوالے سے اس کا خوب ریکارڈ لگا تھا۔ حیدر اور اس کے گروپ کے باقی ارکان کے بارے میں تو فلک کی رائے شروع دن سے ہی بہت خراب تھی مگر امیر حمزہ ان کے گروپ کا وہ واحد بندہ تھا جسے فلک وغیرہ قدرے غنیمت سمجھا کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ ان لوگوں کی کبھی براہِ راست ٹکرار بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ان ہی کی بلڈنگ میں ان کے بالکل سامنے والے فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس نے اور اس کے انٹیریئر سندھ سے آئے فرینڈ یاسین سومرو نے وہ فلیٹ کرائے پر لے رکھا تھا اور وہ دونوں وہاں کا کرایہ شیئر کرتے تھے۔ وہ کراچی ہی کا رہنے والا تھا اور اس کا گھر سندھی مسلم سوسائٹی میں تھا۔

ان لوگوں کے حیرت بھرے استفسار کے جواب میں اس نے بتایا کہ ان کے گھر میں جوائنٹ فیملی سسٹم ہے اور وہاں وہ توجہ سے پڑھائی نہیں کر پاتا اسی لیے فلیٹ لے لیا ہے۔

ناجیہ کو پڑھائی وغیرہ کے بہانے پر بالکل یقین نہ آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گھر پر لڑکیوں سے چیٹنگ اور آوارہ گردیوں کا موقع اتنا آزادانہ کہاں میسر آتا ہوگا۔

☆

ڈاکٹر آفاق کا دیا ہوا اسائنمنٹ پوری کلاس میں سب سے اچھا امیر حمزہ کا تھا۔ فلک نے اس سے اسائنمنٹ دیکھنے کے لیے مانگا تو اس نے بڑی فراخ دلی سے اپنی پوری فائل اس کے ہاتھ میں پکڑا دی تھی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ فلک نے وہ فائل کسی قیمتی خزانے کی طرح فوراً لے لی تھی۔ اس میں حمزہ کے بنائے مختلف اسائمنٹس اور نوٹس وغیرہ سب ہی کچھ موجود تھی۔ دو دن بعد واپس کرنے کی شرط پر وہ اس فائل کو گھر لے آئی تھی۔

شومئی قسمت کہ اسی روز بخار نے اسے ایسا جکڑا کہ وہ فائل دیکھنا بھی بھول گئی۔ ناجیہ وغیرہ کو بھی فائل کی بابت بتانا اسے یاد نہیں رہا۔

ایک ہفتے کے بعد وہ بستر سے اٹھنے کے قابل ہوئی اور اسے حمزہ کی فائل اور اپنا وعدہ یاد آیا تو سخت ملال ہوا۔ وہ پھوپھی صاحب سے اجازت لے کر ان کے فلیٹ میں چلی آئی۔

اسے دیکھ کر امیر حمزہ نے بڑی گرم جوشی سے مسکرا کر ویلکم کہا تھا۔ اسے لیونگ روم میں بٹھا کر وہ خود غالباً چائے، کافی لینے کچن میں چلا گیا تو اس کی نظر سامنے والے کمرے کے کھلے دروازے سے نظر آتی دیوار پر لگی مختلف تصاویر پر پڑی۔ ارمیلا، ایشوریا، جولیا رابرٹس اور کیٹ ونسلیٹ کی بڑی پیاری پیاری اور بے باک تصاویر دیوار پر آویزاں تھیں اور اسے ناجیہ کی بات سے اتفاق کرنا پڑا تھا کہ پڑھائی وغیرہ کا بہانا ہے۔ اپنے گھر میں تو وہ ارمیلا کی فلم بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کجا کہ اس کی تصویر لگانا۔

وہ کافی بنا کر لایا تو اس کی نظروں کا زاویہ محسوس کرتے ہوئے جلدی سے اٹھ کر سامنے والے کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا۔

''یہ یاسین کا بیڈ روم ہے۔''

وہ کچھ شرمندہ سا ہو کر وضاحتی انداز میں بولا تو اس نے اپنی مسکراہٹ بمشکل دبائی۔ پھر اس سے فائل پہنچانے میں دیر ہونے پر معذرت اور کل ہر قیمت پر واپس کرنے کے وعدے پر وہ وہاں سے اٹھ آئی تھی۔ اپنی طرف سے اس نے اخلاق نباہ دیا تھا۔ خود جا کر ایکسکیوز کر لیا اور کیا چاہیے مگر اگلے روز جب وہ اور تاجیہ ڈیپارٹمنٹ پہنچیں تو آس پاس سے گزرتے اپنے کلاس فیلوز اور بعض جونیئر اور سینئر کولیگز کی بے وجہ مسکراہٹ ان دونوں ہی کی سمجھ سے باہر تھی۔

حمزہ اور حیدر سے کوریڈور میں ملاقات ہوئی تھی اور حیدر کو نظر انداز کر کے ان دونوں ہی نے حمزہ سے دعا سلام کی تھی مگر اسے پتا نہیں تھا کہ جسے وہ بہت سیدھا اور معصوم سمجھ رہی ہے وہ اپنے باقی گروپ ممبرز کا بھی باپ ہے۔ کلاس کے پاس پہنچیں تو افرحہ وغیرہ سخت غصے کے عالم میں باہر ہی کھڑی مل گئیں۔ کلاس میں بورڈ کے پاس اسٹوڈنٹس جمع تھے۔ اسے آتا دیکھ کر سب جلدی جلدی بڑی سنجیدگی سے اپنی سیٹس کی طرف بڑھ گئے تھے۔ بلیک بورڈ پر بڑا سا سفید رنگ کا کاغذ آویزاں تھا جس پر سیاہ روشنائی سے بڑا بڑا ''شہزادی کی یاد میں'' لکھا ہوا تھا۔ اگلی لائن میں نسبتاً چھوٹے حروف میں بریکٹ کے اندر لکھا گیا تھا فیض کی روح سے معذرت کے ساتھ۔ ہیڈنگ پڑھ کر ہی وہ طیش میں آ گئی تھی۔ اپنے نام کی انفرادیت کا اس حد تک اندازہ تو اسے بہر حال تھا کہ پورے ڈیپارٹمنٹ میں اس کے علاوہ ''شہزادی'' اور کوئی نہیں تھی۔ اس سے نیچے کی نظم تو اس کا پارہ ساتویں آسمان پر پہنچا گئی تھی۔

مجھ کو شکوہ ہے شہزادی کہ تم جاتے ہوئے\
لے گئیں ساتھ میری اسائمنٹس کی کتاب\
اس میں لیکچر تھا مرا، اور مرا پوئٹری کا نصاب\
آ کے لے جاؤ تم ورڈز ورتھ کی شاعری\
یا شیکسپیئر کے ڈرامے کی کتاب\
مجھ کو لوٹا دو میری اسائمنٹس کی کتاب

یہ نظم صرف کلاس روم ہی نہیں بلکہ لیکچر ہال، لابی، سیمینار لائبریری اور نوٹس بورڈ تک پر آویزاں کی گئی تھی۔ وہ ڈیپارٹمنٹ میں بے تحاشا مشہور و معروف تو تھی نہیں کہ ہر کوئی اسے جانتا ہو مگر اس واقعہ کے بعد اکثریت اسے جاننے لگی تھی۔ اسی روز اپنے آس پاس سے گزرتے کتنے اسٹوڈنٹس کے منہ سے اس نے سنا تھا۔

''یار! یہ شہزادی کون ہے؟'' اور وہ اپنی دوستوں کے سمجھانے بجھانے پر بمشکل اپنا اشتعال کنٹرول کر پائی تھی۔

''اگر تم غصے میں آؤ گی تو نقصان تمہارا ہی ہے۔ اپنی صلاحیتوں کو غصے میں ضائع کرنے کے بجائے دشمن کو پسپا کرنے کی تدبیر سوچو۔''

فاطمہ نے بڑی سنجیدگی سے اسے سمجھایا تھا۔ پھر اس روز گھر آ کر وہ فائل اٹھا کر بڑے جارحانہ انداز میں جا کر امیر حمزہ کے منہ پر مار آئی تھی اس نے بڑی قسمیں کھائی تھیں کہ یہ نظم اس نے نہیں لگائی بلکہ یہ کسی اور کلاس فیلو کی شرارت ہے مگر فلک کو اس کی اس بکواس پر ہرگز یقین نہ آیا تھا۔

فلک نے اس سے فائل اس کے فلیٹ میں جا کر لی تھی اور وہاں اس وقت یاسین کے علاوہ کوئی نہیں تھا تو پھر باقی لوگوں کو کیا فرشتوں نے آکر یہ بات بتائی تھی۔ پھر وہ جو سمجھا کرتی تھی کہ امیر حمزہ اپنے باقی گروپ ممبرز کے مقابلے میں بڑا نیک اور شریف ہے اس نے اپنے اس خیال پر نظر ثانی کر لی تھی۔ واقعی انسان کی پہچان دوستوں سے ہوتی ہے۔ اگر اس کے باقی دوست چالاک، مکار، عیار اور کمینے تھے تو وہ اچھا کیسے ہو سکتا تھا۔ پھر اس واقعہ کے بعد وہ ہر جگہ شہزادی کے نام سے پہچانی جانے لگی تھی۔ لائبریری میں داخل ہوتی تو کسی کونے سے آواز آتی۔

''باادب باملاحظہ ہوشیار شہزادی صاحبہ تشریف لا رہی ہیں۔'' یا کوریڈور سے گزرتی تو دائیں یا بائیں سے آواز آتی ''شہزادی، دی پرنسس آف کراچی یونیورسٹی۔''

اور وہ مڑ کر کسی کو کچھ کہہ اس لیے نہیں سکتی تھی کہ اتنے سارے لڑکوں میں اسے یہی نہیں پتا چلتا تھا کہ کمنٹس دیئے کس نے ہیں مگر اپنے نام اور حیدر کے گروپ سے اس کی نفرت انتہاؤں کو چھونے لگی تھی۔ یہ تمام واقعات تھے اس وقت کے جب وہ لوگ فرسٹ سمسٹر میں تھے۔ ڈرامہ لکھنا اور امیر حمزہ کا ڈرامہ منتخب ہو جانے والا واقعہ اس کے ٹھیک ایک سال بعد یعنی جب وہ لوگ آنرز کے دوسرے سال میں تھے تب پیش آیا تھا اور ماضی کے تلخ تجربات کی روشنی میں ہی ناجیہ نے اسے کہانی بھیجتے وقت اس پر اپنا نام شہزادی فلک ناز کی جگہ صرف فلک ناز لکھنے کا مشورہ اسی لیے دیا تھا۔

''اگر خالی فلک ناز لکھا تو اکثریت یقین ہی نہیں کرے گی کہ کہانی میں نے لکھی ہے۔ میں پورا نام لکھوں گی۔''

اتنی محنت وہ حیدر لوگوں کی اتراہٹ کم کرنے کے لیے ہی تو کر رہی تھی اور اگر ان لوگوں نے شک کیا کہ کہانی اس کی نہیں تو پھر۔ اسی وجہ سے اس نے اپنا مکمل نام لکھا تھا۔ اس بات کی بھنک بھی وہ حیدر لوگوں کو نہیں پڑنے دینا چاہتی تھیں۔ یہ بات صرف اور صرف ان ساتوں کے بیچ تھی۔

''جب میری کہانی پاکستان کے سب سے معیاری ماہنامہ میں چھپے گی تو ان لوگوں کو خود پتا چل جائے گا۔'' وہ اکڑ کر بولی۔

''جی جی، سورج طلوع ہوتا ہے تو سب ہی کو پتا چل جاتا ہے کہ سورج نکل آیا ہے۔ کسی کو جا کر بتانا تھوڑی پڑتا ہے کہ حضرت سورج طلوع ہو چکا ہے۔'' افشاں نے حسب دستور مذاق اڑایا تھا۔

کہانی پوسٹ کرنے وہ سب کی سب باجماعت گاڑی میں ٹھنس ٹھنسا کر گئی تھیں۔ سعدیہ گاڑی پارکنگ میں سے نکال رہی تھی جب سامنے سے آتے یاسین سے ان لوگوں کی ہائے ہیلو ہوئی تھی۔ وہ ان لوگوں کا کلاس فیلو نہیں تھا بلکہ این ای ڈی میں پڑھ رہا تھا مگر پڑوسی ہونے کے ناتے ان لوگوں کی اس سے دعا سلام تھی۔

فلک نے بڑے آرام سے ہاتھ میں اپنی پیک شدہ کہانی پکڑی ہوئی تھی۔ ناجیہ کے کہنی مارنے پر اسے سخت غصہ آیا تھا اور یاسین کے وہاں سے جاتے ہی وہ اس پر بگڑی تھی۔

''یہ کیا تم مجھے کہنیاں مار رہی تھیں؟''

''تو تمہیں کون سی عقل آ گئی، میرے ٹوکنے پر بھی لفافہ اتنے کھلم کھلا ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھیں کہ اس نے دیکھ ہی لیا ہوگا۔ پتا نہیں تمہیں عقل کب آئے گی۔'' وہ جواباً اس سے زیادہ غصے میں آ گئی تھی۔

''لو یاسین کا اس قصے سے کیا تعلق، وہ کوئی حیدر لوگوں کے گروپ کا ممبر ہے، اس سے کیا چھپانا۔''

وہ لاپروائی سے بولی تھی مگر ناجیہ کی بات صحیح ثابت ہوئی تھی وہ بھولا مسکین سا یاسین مخبری میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا اور تب اس نے پہلی بار دنیا کی بے ثباتی، لوگوں کی مکاری اور اپنی سادگی پر سنجیدگی سے غور کیا تھا۔ کہنے کو تو وہ فلیٹ صرف امیر حمزہ اور یاسین کا تھا مگر حیدر سمیت ان کے گروپ کے تمام لڑکے آدھے سے زیادہ مہینہ یہیں قیام وطعام فرماتے تھے۔

کتنی دیر میں جا کر یہ بات اس کی سمجھ میں آئی تھی کہ یاسین ان کے گروپ کا خفیہ ممبر تھا۔ فوری طور پر تو ان لوگوں کو شک بھی نہیں ہوا کہ حیدر لوگ اس بات سے واقف ہو چکے ہیں کہ اس نے کوئی کہانی لکھ کر کسی رسالے میں بھیجی ہے۔

مگر دو مہینے بعد جب پرچہ ہاتھ میں آنے پر اس نے ''اشاعت سے معذرت'' میں اپنا نام جگمگاتا دیکھا اور اس کے بعد حیدر لوگوں نے جو اس کا ریکارڈ لگایا تب اسے ناجیہ کی بات سے اتفاق کرنا پڑا تھا۔ کہانی بھیجنے کے بعد ان لوگوں کا خیال تھا کہ دو تین مہینے صبر سے بیٹھ کر اس کے چھپنے کا انتظار کریں گے، اس دوران وہ مزید کئی کہانیاں لکھ چکی تھی۔

ڈائجسٹ کیونکہ معیاری تھا اس لیے وہاں سینئر اور منجھی ہوئی رائٹرز کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والے بھی بہ کثرت اپنی تحریریں بھیجا کرتے تھے اور پھر خطوط میں اپنی تحریروں کے قابلِ اشاعت ہونے یا نہ ہونے کی بابت سوالات پوچھا کرتے تھے۔ لوگوں کو اس زحمت سے بچانے کے لیے رسالے کی ایڈیٹر نے ڈائجسٹ کا ایک صفحہ ''اشاعت سے معذرت'' کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ جس میں بڑے دکھ سے اطلاع دی جاتی تھی۔

''یہ خواتین و حضرات اپنی تحریروں کی اشاعت کا انتظار نہ کریں۔''

اور پھر لائن سے ان تمام ناکام ونامراد لوگوں کے نام درج ہوتے تھے۔ اس کے دشمن تو تھے ہی موقع کی تاک میں چنانچہ اگلے ہی روز اس پر کاری وار کیا گیا۔ ایک تو وہ ویسے ہی جلی بیٹھی تھی، ڈائجسٹ والوں کی ناقدری پر جتنا بھی غم مناتی کم تھا، اوپر سے وہ لوگ اسے ٹیز کرنے کا یہ نادر موقع ہاتھ سے گنوانے کے موڈ میں نہیں تھے۔

فرض کرو شہزادی نے رسالے میں بھیجی اک کہانی ہو

فرض کرو ردی کی ٹوکری میں گئی وہ کہانی ہو

فرض کرو شہزادی نے نیند میں دیکھا مکمل ناول چھپتا ہو

بے کل ہو کے من یہ چاہے کاش یہ سپنا سچا ہو

پھر در و دیوار اس کا مذاق اڑانے کو تیار تھے۔ ڈیپارٹمنٹ کا کوئی کونا ایسا نہیں تھا جہاں ان منحوسوں نے اپنی اعلیٰ پائے کی شاعری نہ کی ہو۔

''خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو شہزادی۔''

اس سے اگلے روز بلیک بورڈ پر فیض کی اتنی خوبصورت نظم کا حشر نشر کیا گیا تھا۔ پروفیسر عثمان نے بھی کلاس میں آ کر اس نظم کو دیکھ کر بڑی مشکلوں سے اپنی مسکراہٹ ضبط کی تھی۔ اس کا دل تو کرچی کرچی ہو کر ٹوٹ چکا تھا یہاں تک کہ ان لوگوں سے لڑنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ناجیہ بلیک

کلر کا مار کر ہاتھ میں لے کر اس نظم کے نیچے بڑے غصے میں لکھ کر آئی تھی

تری کمینگی کی انتہا چاہتی ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتی ہوں

گروپ کے باقی ممبرز نے اسے شاباشی دی تھی مگر فلک کا دل اب اس دنیا سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ اس دنیا میں فن کی قدر نہیں۔ یہ ایڈیٹر صاحبہ اپنے رشتے داروں کی کہانیاں چھاپتی ہوں گی۔ وہ دکھی دل سے اسی قسم کی باتیں سوچ رہی تھی۔ اس کی دوست اس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہی تھیں، تسلیاں اور دلاسے دیئے جا رہے تھے۔

اس روز یونیورسٹی سے واپسی میں بجائے سیدھے گھر جانے کے ان لوگوں نے کراچی کی خوب خاک چھانی تھی۔ ''پارک ٹاورز'' میں ''یاسر وحید'' کے لان پرنٹس کی نمائش لگی ہوئی تھی، وہ لوگ گھنٹوں وہاں گھومی تھیں۔ ''گلف'' سے ان لوگوں نے اوٹ پٹانگ ڈھیر ساری چیزیں خریدی تھیں۔ یمینہ نے اسے یاسر وحید کا ڈیزائن کردہ لان کا سوٹ لے کر دیا تھا تو فاطمہ نے اپنے پیسوں سے اسے بہت سارے ہیئر کلپس اور ہیئر بینڈز دلوائے تھے۔ افرحہ جس کی کنجوسی سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل تھی اس نے سب کو میکڈونلڈز سے اپنے پلے سے آئس کریم کھلائی تھی۔ غرض یہ کہ وہ سب اسے صدماتی کیفیت سے نکالنے میں بڑی مخلصانہ کوششیں کر رہی تھیں۔

سب دوستوں کا خیال تھا کہ آئندہ وہ لکھنے سے توبہ کر لے گی خصوصاً ناجیہ اور افشاں جو اس کی موڈی فطرت سے بخوبی آگاہ تھیں۔ انہیں سو فیصد یقین تھا کہ آئندہ لکھنا تو درکنار وہ لکھنے کا نام لینا بھی گوارا نہ کرے گی مگر ان سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی جب انہوں نے اگلے ہی روز اسے اپنی دوسری کہانی پوسٹ کرتے دیکھا۔ ان دو مہینوں میں وہ سات آٹھ کہانیاں تو لکھ ہی چکی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور دھڑا دھڑ سب کی سب آگے پیچھے پوسٹ کر دیں۔ اس کا یہ شوق شاعری، پینٹنگ، ککنگ، انٹیریئر ڈیزائننگ اور فوٹوگرافی کی طرح کا شوق ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ اس بار میدان چھوڑنے کیلئے تیار نہ تھی۔

''میرے ارادوں کی پختگی کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ جن کی تحریریں چھپ رہی ہیں وہ کوئی آسمان سے نہیں اتریں۔ اگر وہ ایسا لکھ سکتی ہیں کہ جو چھپ سکے تو میں بھی ایسا لکھ کر دکھاؤں گی۔'' وہ ایک نئے عزم سے میدان عمل میں کودی تھی۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

سعدیہ نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کمر تھپتھپا کر مصرعہ سنایا تھا اور بس پھر اس نے نہ دن دیکھا نہ رات مسلسل اور انتھک محنت کو اس نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔

تھیم تو پہلے کی طرح ابھی بھی وہ سب مل کر ہی ڈھونڈتی تھیں مگر اس کے بعد کا سارا کام وہ ''ننھی سی جان'' تنہا کیا کرتی تھی۔ آدھی رات کو وہ سوتے سے افشاں کو اٹھا دیتی۔ وہ بے چاری آنکھیں ملتی ہوئی ہکابکا اس کی شکل دیکھتی تو بڑی سنجیدگی سے پین منہ میں دبائے سوال کرتی۔

''ہابیل نے قابیل کو قتل کیا تھا یا قابیل نے ہابیل کو؟''

افشاں کا دل چاہتا کہ اس کا سر پھاڑ دے، رات کے تین بجے سوتے سے اٹھا کر اتنے بے تکے سوال کا پس منظر اسے اچھی طرح معلوم تھا۔

''یار! مجھے اپنے ہیرو کا کوئی یونیک سا نام رکھنا ہے۔ نام تو میرے ذہن میں آ گیا۔ اب کنفیوژن یہ ہے کہ کہیں میں ہیرو کا نام قاتل بھائی کے نام پر نہ رکھ دوں۔'' وہ معصومیت سے عرض کرتی۔

''ان دونوں میں سے تو جس نے بھی جس کو قتل کیا ہو مگر آپی جان! آپ ضرور میرے ہاتھوں قتل ہو جائیں گی۔'' وہ سخت طیش میں آ کر چلاتی اور پھر اپنے اور اس کے مشترکہ کمرے سے واک آؤٹ کر کے پھوپھی صاحب کے بیڈروم میں جا کر سو جاتی۔

''لو بلاوجہ ناراض ہو رہی ہے، کل کو جب میں مشہور رائٹر بن جاؤں گی تو خود ہی ہر ایک کو اترا اترا کر بتایا کرے گی کہ شہزادی فلک ناز میری بڑی بہن ہیں۔ جی ہاں وہ ہی جن کے افسانوں کا مجموعہ پچھلے ماہ لندن سے شائع ہوا ہے۔ جی ''اسٹار پلس'' سے عنقریب ان کا لکھا ہوا ڈرامہ ٹیلی کاسٹ ہونے والا ہے۔ ہاں جیمز کیمرون سے ان کی بات چیت تقریباً فائنل ہو چکی ہے۔ وہ ٹائی ٹینک کی طرز پر ایک اور فلم بنا رہے ہیں، اس کی کہانی آپی جان یعنی شہزادی فلک ناز ہی لکھ کر دیں گی۔ بس آپی جان کی شرط یہ ہے کہ ہیرو ہیروئن ان کی پسند کے ہوں۔ اسی بات پر ذرا سا اختلاف ہے۔ آپی جان ٹام کروز کو ہیرو کے طور پر لینا چاہتی ہیں اور وہ وین ڈیم کو لینے پر مصر ہیں۔''

وہ کہانی چھوڑ چھاڑ چشمِ تصور میں خود کو ہالی ووڈ میں کھڑا پاتی۔ اچھے اچھے ڈائریکٹرز اس کی کہانیوں کو حاصل کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگاتے نظر آ رہے تھے۔ سوچتے سوچتے ہی اکثر اسے نیند آ جایا کرتی تھی۔ ہر مہینے ''اشاعت سے معذرت'' میں سب سے اوپر اسی کا نام ہوتا تھا۔ اس بارے میں افشاں کا خیال یہ تھا کہ اس کا نام چونکہ ایڈیٹر کو حفظ ہو چکا ہے اس لیے ہر بار لسٹ تیار کرتے وقت خود بخود سب سے پہلے اسی کا نام وہ لکھ لیتی ہیں۔

''آپی جان! آپ خوش قسمت ہیں کہ بغیر چھپے بھی آپ کو ادارے کے تمام ارکان اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ ہر مہینے کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ دس مرتبہ جب وہ آپ کے افسانے اور ناول وصول کرتی ہوں گی تو ان کے دل پر کیا بیتتی ہو گی وہ خود ہی جانتی ہوں گی، پھر دل پر ہزار جبر کر کے اپنی پروفیشنل ذمہ داری نبھانے کی خاطر اسے پڑھتے ہوئے ان کا دل سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جانے کو چاہتا ہو گا جس طرح بچپن میں اکثر بچے الجبرا پڑھنے سے بھاگتے ہیں بالکل ایسے ہی وہ ان تحریروں کے نام سے کانپ جاتی ہوں گی۔''

افشاں کے دل خراش تبصروں میں مزید اضافہ فاروق اور خرم کیا کرتے تھے۔

''یار! کچھ بھی کہو، فلک کی وجہ سے ان لوگوں کو فائدہ بھی بہت ہے۔ وہ اپنے ڈائجسٹ کی سرکولیشن سے اتنا نہیں کماتے ہوں گے جتنا ہر مہینے ردی بیچ کر کمانے لگے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے ایک نیا سیکشن اسی مقصد کے لیے بنا لیا ہو جس کا نام ''ردی سیکشن'' اور باقاعدہ وہاں بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کیے ہوئے کسی بندے کو اپوائنٹ کیا ہو جو بخوبی ردی سے متعلق تمام امور میں ڈیل کرتا ہو۔''

فاروق اور خرم ہر ہفتہ کراچی نازل ہوتے تھے اور آ کر اسی طرح کی گفتگو کر کے اس کی ہمت پست کرنے کی کوششیں کی جاتی تھیں۔

''ارے کل کی بات سنو، میں نے ''گلاب پان ہاؤس'' سے الائچی اور سونف والا پان خریدا، پان کھا کر جو کاغذ پھینکنے لگا تو فلک کی رائٹنگ

پر نظر پڑی اور اس کی رائٹنگ تو میں ہزاروں میں بھی پہچان سکتا ہوں۔ کاغذ پر سے بطخ گزری ہوئی الگ ہی پتا چل جاتی ہے۔ سچ فلک! تمہاری شہرت حیدر آباد تک اس رڈی کی بدولت پہنچ رہی ہے۔''

خرم کیوں پیچھے رہتا اس نے بڑی سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کی تھی۔ پھوپھی صاحب جو بچوں کی گفتگو سے بے نیاز بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں انہوں نے بھی بمشکل اپنی مسکراہٹ بھتیجی سے چھپائی تھی۔

''اچھا اس کاغذ پر لکھا ہوا کیا تھا؟'' فاروق اور افشاں اسے مزید شہ دیتے۔ ناجیہ کی دال بھی ان تینوں کے آگے نہیں گلتی تھی اس لیے وہ بھی اس کی مدد کرنے سے قاصر ہی رہا کرتی تھی۔

''اس پر لکھا ہوا تھا کہ چودھری قطب الدین ایبک کے چھ بیٹے تھے۔ سب سے بڑے ظہیر الدین بابر، ان سے چھوٹے جلال الدین اکبر، ان سے چھوٹے ابراہیم لودھی، ان سے چھوٹے محمود غزنوی، ان سے چھوٹے اسد اللہ غالب اور سب سے چھوٹے مومن خان مومن۔ تقسیم ہند کے بعد وہ اپنی بیوی چمن آرا اور بیٹوں کے ساتھ لاہور میں آباد ہو گئے تھے۔ سب سے بڑے ظہیر الدین بابر کی شادی انہوں نے اپنی پھپھیری بہن کی بھتیجی کی بیٹی سے کی تھی اور ان کے چار بچے تھے سب سے بڑا بیٹا نسیم حجازی اس سے چھوٹی بدر النساء پھر اس سے چھوٹا......'' فاروق اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے مزید بولنے سے روکتے ہوئے کہتا۔

''بس کرو یار! سر میں درد شروع ہو گیا۔ یہ تم فلک کی کہانی سنا رہے ہو یا کسی کا شجرہ نسب بیان کر رہے ہو۔'' وہ ان کی کمینگی پر جتنا بھی تپتی کم تھا۔ رائٹنگ ٹیبل پر رکھی اس کی تازہ ترین کہانی کا وہ لوگ دل کھول کر مذاق اڑا رہے تھے۔ افرحہ کے مشورے پر وہ بہت بڑے کنبے کے اوپر کہانی لکھ رہی تھی جس میں ڈھیر سارے کزنز ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ افرحہ کا خیال تھا کہ ایسی کہانیاں لوگ زیادہ پسند کرتے ہیں۔

''ابھی تو میں نے تعارف بھی پورا نہیں کروایا تھا۔ ابھی تو ہیرو ہیروئن کا انٹروڈکشن بھی نہیں ہوا۔ منجھلے بھیا کا اکلوتا بیٹا ہابیل اور سب سے چھوٹے بھائی کی اکلوتی بیٹی رشیدہ۔ خیال رہے کہ ہیرو ہیروئن کا اکلوتا ہونا از حد ضروری ہے۔ تعارف کے انداز سے ہی پڑھنے والے کو پتا چل جائے گا کہ سب سے ذہین اور بے حد ہینڈسم، انتہا سے زیادہ ایمان دار اور سچا بندہ ضرور ہیرو ہی ہو گا اور سب سے چھوٹے بھیا کی اکلوتی دختر رشیدہ جو ماں باپ کے مرنے کے بعد گھر والوں کے ظلم وستم کا نشانہ بن رہی ہے۔ جب وہ کھڑے کھڑے جھٹ پٹ مولیوں کے پراٹھے اور آلو میتھی پکا کر لا رہی ہوتی ہے تو پڑھنے والا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ ہو نہ ہو یہی ہیروئن ہے۔'' خرم دانت نکالتے ہوئے کہتا۔

''ویسے تم ہیرو کے نام میں جتنی انفرادیت ڈھونڈتی ہو ہیروئن کے نہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟''

فاروق اس کے کندھے کے گرد اپنا ہاتھ پھیلاتا ہوا بڑی سنجیدگی سے دریافت کرتا اور وہ جو یہ عہد کیے بیٹھی تھی کہ دنیا والوں کے طعنوں اور حوصلہ شکن رویوں سے کبھی بھی بد دل نہیں ہو گی، مستقل مزاجی سے سنجیدہ چہرہ بنائے خاموشی سے بیٹھی رہتی۔ اگر ان لوگوں کو اس کے چڑنے کا پتا چل گیا تو وہ اور زیادہ چڑایا کریں گے۔

''میرا خیال ہے آپی جان! ہیروئن کا کریکٹر اپنے آپ کو سامنے رکھ کر لکھتی ہیں۔ اسی لیے اس کا نام خوب چھانٹ کر پرانے زمانے کا رکھتی

ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ہر مرتبہ ہیروئن کے کردار میں یہ خود ہی جلوہ افروز ہوتی ہیں تب ہی تو ان کی ہیروئن بے چاری بس عام سی شکل وصورت کی ہوتی ہے۔ نہ اس کی زلفیں ناگن سی ہوتی ہیں نہ رنگ شہابی نہ چہرہ کتابی نہ گالوں میں ڈمپل پڑے ہیں اور نہ ہی آنکھیں نیلی یا سبز ہوتی ہیں مگر اس عام سی شکل صورت کے باوجود اس میں کوئی بات ہوتی ہے، کچھ خاص بات جو سوائے ہیرو کے کسی کو نظر نہیں آتی۔ حاضرین نوٹ فرمائیے یہاں زور ''خاص بات'' پر ہے اور اس ''خاص بات'' کی وضاحت بے چاری مصنفہ خود بھی نہیں کر پاتیں۔ ہیرو البتہ چھ فٹ اونچا، خوب ہینڈسم، بڑی بڑی براؤن کلر کی کشادہ آنکھیں بلیک سوٹ پہنے سگریٹ پیتا ہوا اتنا ڈیشنگ لگتا ہے کہ کتنوں کے تو دل ہی دھڑکنا بھول جاتے ہیں۔''

یہ گل افشانی افشاں صاحبہ فرماتیں اور وہ اپنے آنسو پیتی بمشکل وہاں بیٹھی رہتی۔ ہر بار جب اس کی ہمت ایسے تبصروں کی وجہ سے پست ہونے لگتی تو وہ خود کو یاد دلاتی کہ ایسا صرف اسی کے ساتھ نہیں ہو رہا، اس ظالم دنیا نے ہر اچھے شاعر، مصور اور ادیب کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا ہے۔ کبھی بھی کسی فنکار کی قدر اس کی زندگی میں نہیں ہوئی۔ آج جو ہم بات بے بات غالب کے اشعار اپنی گفتگو میں کوڈ کرتے ہیں۔ ذرا سوچیں کہ ان کے زمانے میں ان کے ساتھ کتنا برا سلوک ہوا تھا۔ بس ایسا ہی اس کے ساتھ ہو رہا ہے۔

کچھ بھی تھا، وہ ایسی باتوں سے ہمت ہارنے والی نہیں تھی۔ وہ دنیا والوں کو بتا دے گی کہ اس میں کتنا ٹیلنٹ چھپا ہوا ہے۔ اس کی کہانیاں بھیجنے کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

''آپ اپنی مشقِ ستم جاری رکھیے، میں ہمت ہار کر میدان چھوڑنے والوں میں سے نہیں۔''

وہ غائبانہ ایڈیٹر کو مخاطب کرتی۔ اس کی دوستوں کا تعاون روزِ اول جیسا ہی تھا۔ ہر بار سب دل وجان سے اس کے ساتھ تھیم سے لے کر آخری سین تک ساتھ ساتھ ہوتیں۔ کبھی وہ اس کے ساتھ گھر آ کر کہانی پڑھا کرتیں اور کبھی وہ یونیورسٹی لے جا کر کامن روم میں ان لوگوں کو پڑھوایا کرتی تھی۔ اس نے عروس اور ناجیہ کے مشورے پر ایک نئی کہانی شروع کی تھی۔ حسبِ سابق سب سے پہلا اور اہم مسئلہ ہیرو کے نام کا تھا۔ سب ہی مختلف نام تجویز کر چکی تھیں مگر وہ مطمئن نہ ہو رہی تھی۔

رات سونے سے پہلے عروس نے فون کر کے کہا کہ ہیرو کا نام جبرائیل رکھ لو، اسے اور ناجیہ کو تو نام ایک دم منفرد لگا تھا۔ آج تک کبھی کسی رائٹر نے اپنے ہیرو کا نام جبرائیل نہیں رکھا۔

''پھر اس کے بڑے بھائی کا نام ہوگا اسرافیل، چھوٹے کا نام ہوگا میکائیل اور ابا کا نام ہوگا عزرائیل۔'' افشاں نے ان دونوں کی گفتگو کے بیچ میں ٹانگ اڑانا اپنا اخلاقی فرض سمجھا تھا۔

''تم جا کر الٹی سیدھی لائنیں کھینچ کر دوسروں کی چیٹنگ کر کر کے گھروں کے نقشے بناؤ، ان باتوں میں تمہارے جیسے خشک اور بور لوگوں کا کیا کام۔ جاؤ جا کر سوچو کہ ڈرائنگ روم میں کتنی کھڑکیاں کھلنی چاہیے اور پیج کتنا چوڑا ہونا چاہیے۔'' افشاں کو لتاڑ کر وہ جلدی سے کہانی لکھنے بیٹھ گئی تھی۔

''یار! میں اپنے ہیرو کا پروفیشن کیا دکھاؤں؟''

صبح گھر سے نکلتے ہوئے وہ ناجیہ اور عروس سے سوال کرتی۔ عروس کا گھر قریب ہی تھا اور وہ ان لوگوں کے ساتھ ہی یونیورسٹی جایا کرتی تھی۔

''آرمی میں دکھا دو۔'' عروس مشورہ دیتی۔

''نہیں پچھلی دو کہانیوں میں بھی ہیرو آرمی میں دکھایا تھا اور دونوں ریجیکٹ ہو گئیں۔ اب مجھے آرمی میں دکھاتے ہوئے وہم آ رہا ہے۔'' وہ اپنی مجبوری بیان کرتی۔

''اچھا پھر سول سروس میں۔'' ناجیہ جھٹ دوسرا آئیڈیا پیش کرتی۔

''سول سروس کے بھی تو اتنے سارے شعبے ہیں، وہ جاب کہاں کرتا ہوگا۔'' وہ اتفاق کرتے ہوئے اگلا سوال کرتی۔

''انکم ٹیکس میں دکھا دو۔''

''نہیں۔''

''اچھا کسٹمز میں۔'' دوسرا مشورہ دیا جاتا۔

''بھئی نہیں ناں۔ سب سمجھیں گے کہ میرا ہیرو رشوت خور ہے۔ ان محکموں کی ریپوٹیشن نہیں پتا تمہیں۔'' وہ پھر انکار کرتی۔

''اچھا ریلویز۔''

''نہیں اس سے غربت ٹپکتی ہے، میرا ہیرو جہاز سے نیچے کبھی نہیں اترا۔'' وہ اتراتی۔

''اچھا بابا پولیس سروس۔'' ناجیہ چڑ کر کہتی۔

''ہاں تاکہ وہ حیدر لوگ میرے ہیرو کو ٹلا ٹلا کہہ کر چھیڑیں۔''

وہ جل کر کہتی اور اسی وقت لفٹ کے پاس کھڑے حیدر، امیر حمزہ، بابر اور یاسین اسے نظر آ جاتے۔ وہ لوگ بظاہر ان کی گفتگو سے انجان بنے آپس میں باتیں کر رہے تھے مگر کان درحقیقت ادھر ہی لگے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کو نظر انداز کرتی وہ لوگ سیڑھیوں سے نیچے اتر آئیں اور پھر یونیورسٹی پہنچنے تک ہیرو کا پروفیشن ہی موضوع بحث بنا رہا۔ آخر کار بڑی مشکلوں سے ڈی ایم جی پر آ کر اتفاق رائے ہوا۔

وہ ان دنوں سخت محنت کر رہی تھی۔ ایک طرف کہانیوں کی محنت اور دوسری طرف پڑھائی۔ پھوپھی صاحب جیسی سخت گیر شخصیت کے ہوتے ہوئے پڑھائی سے لاپروائی کا تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ کلاس میں لیکچر نوٹ کرتے کرتے اچانک اس کا ذہن اپنی کہانی کی طرف چلا جاتا اور وہ بیٹھے بیٹھے آگے کی کہانی کا تانا بانا بننے بیٹھ جاتی۔

اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا وہ اپنی کہانی کی الجھنوں میں گم لیکچر سے لاپرواہ سی تھی، تب ہی پچھلی رو میں بیٹھی ناجیہ نے اس کی کمر پر چٹکی کاٹتے ہوئے ہاتھ نیچے کر کے ایک کاغذ پکڑایا تھا۔

''کیا بات ہے، اتنی اداس اور پریشان کیوں ہو؟''

کاغذ پر لکھی یہ تحریر پڑھ کر اسے ناجیہ کی اپنے متعلق تشویش پر بے اختیار پیار آیا تھا۔

''یار! میری ہیروئن کے ہاں ننھا مہمان آنے والا ہے اب الجھن یہ ہے کہ ہیروئن یہ بات ہیرو کو کس طرح بتائے۔ تمہیں پتا ہے نا، میری

ہیروئن تو ہمیشہ ہی شرمیلی ہوتی ہے۔''

اس نے اسی کاغذ پر دردِ دل لکھا اور اس کا گولا بنا کر پیچھے اچھال دیا۔ یہ دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی کہ وہ مڑا تڑا کاغذ امیر حمزہ کی نوٹ بک پر جا کر گرا تھا۔ ناجیہ نے اس حرکت پر اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ وہ کلاس شروع ہونے کے بعد آیا تھا اور سر آفاق کے لیکچر سے بچنے کے لیے جلدی سے ناجیہ کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہی کاغذ دوبارہ فلک نے وصول کیا تھا۔ ناجیہ تو اب تک اپنا سر پکڑے بیٹھی تھی جبکہ وہ حیران ہوتی سوچ رہی تھی۔

''یہ ناجیہ کی رائٹنگ چینج کیسے ہوگئی۔''

''ایسا کریں جس وقت ہیرو کے آفس کے گھر آنے کا ٹائم ہو، ہیروئن کو اس وقت اون اور سلائیاں ہاتھ میں پکڑا کر نٹنگ کرنے بٹھا دیں، راکنگ چیئر پر بیٹھی ''شرمیلی'' چھوٹا سا موزہ یا ٹوپا بن رہی ہوگی جس وقت ''صاحب بہادر'' کی انٹری ہوگی اور آپ کا ہیرو اتنا جینئس تو ہوگا ہی کہ سمجھ لے کہ بیگم جون کے مہینے میں نٹنگ کرنے کیوں بیٹھی ہیں۔''

وہ تحریر پڑھتے ہوئے ناجیہ کے طرزِ تخاطب اور رائٹنگ دونوں پر ہی حیران تھی اور امیر حمزہ پیچھے بیٹھا مسلسل مسکرا رہا تھا۔ ناجیہ فلک کی ان لوگوں کے ہاتھوں بننے والی درگت کا ابھی سے سوچ کر ڈر رہی تھی۔ پیریڈ کے بعد جب یہی بات ناجیہ نے فلک کو بتائی تو اس کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ تھوڑی سی شرم بھی آئی تھی۔ کیا سوچ رہا ہوگا حمزہ میں ایسی کہانیاں لکھتی ہوں، پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

''میرے گھر آئی ایک ننھی پری۔''

''تو پھول میرے گلشن کا، تو ہے چاند میرے آنگن کا''

اور

''چندا ہے تو میرا، سورج ہے تو اور میری آنکھوں کا تارا ہے تو'' کی آوازیں چوبیس گھنٹے سامنے والے فلیٹ سے آیا کرتیں اور ہر بار ناجیہ گھور کر اس کی طرف دیکھتی یہاں تک کہ پھوپھی صاحب نے بھی حیرت سے دریافت کیا تھا۔

''یہ لوگ آج کل ہر وقت یہی گانے کیوں لگائے رکھتے ہیں؟''

''حمزہ کی بہن کے ہاں بیٹی ہوئی ہے، بھانجی کی خوشی میں وہ ہر وقت یہ گانے سنتا ہے۔''

افشاں جو ساری صورت حال سے باخبر تھی اس نے بڑے آرام سے انہیں جواب دیا تو وہ گردن ہلاتی چلی گئیں۔

تو یہ تھا عوامل اور واقعات کا مختصر سا ذکر، جن کی وجہ سے فلک نے رائٹر بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب واپس ہم حال کی طرف آتے ہیں یعنی جہاں سے ہم نے اپنی داستان کا آغاز کیا تھا۔ خوب غور سے کان دھر کر سنیں کہ آخر کار ایک سال کی جہد مسلسل کے بعد فلک ناز اپنی تحریر شائع کروانے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔

امتحانوں سے فارغ ہو کر وہ لوگ پھوپھی صاحب کے ساتھ حیدر آباد آئی ہوئی تھیں۔ سمسٹر بریک کے علاوہ وہ لوگ شاذ و نادر ہی حیدر

آباد آتی تھیں۔ ہر دس پندرہ دن بعد مما پاپا کراچی آجایا کرتے تھے۔ پھوپھی صاحب کی ظالم وجابر شخصیت پر تو انہیں کوئی شبہ نہ تھا مگر دل کی تسلی کے لیے خود بھی جلدی جلدی چکر لگایا کرتے تھے۔ اپنا گھر ہونے کی وجہ سے جلدی جلدی آنے اور ایک آدھ دن رک جانے میں بھی کچھ حرج نہ تھا اور یوں ''بچیوں'' کی تعلیمی کارکردگی وغیرہ سے وہ لوگ مسلسل باخبر رہتے تھے۔

آخر کار فلک کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ صبح ناشتے کی میز پر پاپا، مما، فاروق، خرم اور پھوپھی صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ فلک ناشتہ کر کے ابھی ابھی فارغ ہوئی تھی جبکہ ناجیہ اور افشاں ابھی سو کر نہیں اٹھی تھیں۔ عین اسی وقت اخبار والے نے گیٹ پر بیل کر کے ڈائجسٹ اندر اچھالا تھا۔ ہر بار وہ ڈائجسٹ ہاتھ میں لے کر پہلے خوب ساری سورتیں پڑھتی تھی، اس کے بعد آخر کار ڈرتے ڈرتے پہلا صفحہ کھولتی تھی۔ گھر کے باقی افراد نے تو اسے ڈائجسٹ ہاتھ میں لے کر آتے دیکھ کر کسی قسم کے جوش کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ یہ سین بار ہا سب ہی دیکھ چکے تھے۔

آنکھیں بند کر کے اس نے جلدی جلدی درود شریف کا ورد کیا اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ رسالہ کھولا۔ ارے یہ کیا، مکمل ناول ''بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا'' کے آگے شہزادی فلک ناز کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس کہانی میں اس کی ہیروئن کا نام نرگس تھا اور دوسرے یہ کہ اس میں ہیرو نے اپنے دیدوں کا کافی درست اور برمحل استعمال کیا تھا اسی لیے اس نے کہانی کا یہ عنوان تجویز کیا تھا۔ یہ اس کی اب تک کی بھیجی گئی کہانیوں میں سے پہلی کہانی تھی، جس کی تھیم بھی اس نے کہیں سے نہیں چرائی تھی۔

بقول افشاں اس کہانی میں تھیم نام کی کسی چیز کا دور دور تک گزر نہیں تھا اس لیے چرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس کی چیخوں سے گھر کے در و دیوار ہل رہے تھے۔ جو سو رہے تھے ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے تھے اور جو جاگ رہے تھے وہ کانوں میں انگلیاں دیئے اللہ کی پناہ مانگتے ہوئے پوچھ رہے تھے کہ کیا صور اسرافیل پھونکا جا چکا۔ چھلانگیں لگاتی وہ خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر دے۔ برابر والی آنٹی اپنا سب کام کاج چھوڑ چھاڑ ایپرن پہنے بھاگتی ہوئی ان کے گھر آئی تھیں۔

''خیر تو ہے بھابھی! خدانخواستہ امریکہ سے تو کوئی بری خبر نہیں آئی؟'' دادی پچھلے چھ ماہ سے چچا جان کے پاس شکاگو گئی ہوئی تھیں اور وہاں ان کی حالت سخت خراب تھی۔

مما نے ان کی بات کے جواب میں ''ہمارے ایسے نصیب کہاں'' والی شکل بنائی تھی۔ پاپا اور پھوپھی صاحب کی موجودگی کے سبب وہ یہ بات منہ سے بولنے سے قاصر تھیں۔

ابھی وہ اپنی دوستوں کو فون کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ یکے بعد دیگرے سب ہی کا فون آ گیا۔ وہ سب بھی خوشی سے دیوانی ہوتی شاندار سی ٹریٹ کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ چھٹیاں ختم ہونے میں ابھی کافی دن تھے مگر اسے ایک دم کراچی جانے کی جلدی پڑ گئی تھی۔ اس نے اپنے دشمنوں کو دندان شکن جواب دے دیا تھا۔ اب ان کی پسپائی کا نظارہ بھی تو کرنا تھا۔

فاروق کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی کہانی میرٹ کی بنیاد پر شائع ہوئی ہے۔

''ضرور تم نے کچھ دے دلا کر اسے پرچے میں لگوایا ہے۔'' اس کی بات پر ناجیہ کو فلک سے زیادہ غصہ آیا تھا۔

''ارے وہ کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں، صرف اور صرف معیاری تحریریں شائع ہوتی ہیں اس ڈائجسٹ میں۔ تعلقات اور دینے دلانے والی بات وہاں نہیں ہے۔'' وہ آگ بگولا ہو کر بولی تھی۔

''ہاں! اب اپنی کہانی چھپ گئی تو وہ ایماندار، پروفیشنل اور ٹیلنٹ کی قدر کرنے والے ہو گئے۔ کل تک تو رشتے داروں کی کہانیاں چھپا کرتی تھیں۔'' خرم بھی میدان میں کودا تھا۔

''میرا خیال ہے ڈائجسٹ کی ایڈیٹر ہماری آپی جان کی مستقل مزاجی کے سامنے گھٹنے ٹیک گئی ہیں۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ شاید کہانی چھاپ دینے سے ہی ان کا پیچھا ان اعلیٰ پائے کی تحریروں سے چھوٹ جائے۔''

افشاں کیوں دل جلانے میں پیچھے رہتی۔ بہن بھائیوں سے قطع نظر گھر کے بڑوں نے اس کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کی تھی۔ پاپا کا کہنا تھا کہ ان کی بیٹی نے ایک بے حد شاندار اور منفرد کارنامہ سرانجام دیا ہے اور بلاشبہ وہ ان کے خاندان کی پہلی رائٹر ہے۔ ان کی دس پشتوں میں کوئی ادیب نہیں گزرا تھا۔ پاپا نے شاباشی کے طور پر اسے ہزار روپے دیے تھے جن سے وہ لوگ رات میں جا کر آئس کریم وغیرہ کھا آئے تھے۔

کراچی پہنچنے پر اس کی فرینڈز نے اسے ریڈ کارپیٹڈ ویلکم دیا تھا۔ خود وہ اترائی پھر رہی تھی۔ پھوپھی صاحب برتن دھونے کو کہتیں تو جواب آتا۔ ''یہ ہاتھ برتن مانجھنے کے لیے نہیں بنے، یہ ایک آرٹسٹ کے ہاتھ ہیں اور ان میں صرف قلم اچھا لگتا ہے۔'' آٹا گوندھنے کو کہا جاتا تو فلک صدمے سے بے حال ہو جاتی۔

''رائٹر کی یہ قدر ہو رہی ہے اس گھر میں۔ پھوپھی صاحب رائٹرز آٹا گوندھنے اور روٹیاں تھوپنے والے کام کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوتے۔''

''ہاں رائٹرز کو بھوک تھوڑی لگتی ہے۔'' پھوپھی صاحب جل کر کہتیں یا کبھی کبھار تپ کر کہتیں۔

''تمہارے سر پر دو سینگ نہیں نکل آئے۔ جاؤ جا کر دال میں بگھار لگاؤ۔'' گھر میں ہونے والے ان روز مرہ کے معرکوں سے قطع نظر وہ بڑی سنجیدگی سے یونیورسٹی کھلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ سامنے والے فلیٹ پر بھی تالا لگا ہوا تھا۔ امیر حمزہ اور یاسین اپنے تمام دوستوں کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اس سے زیادہ ایکسائٹمنٹ اس کی فرینڈز کو تھی۔

جس روز یونیورسٹی کھلنی تھی وہ لوگ صبح سویرے ہی یونیورسٹی پہنچ گئی تھیں۔ پورا ڈیپارٹمنٹ ویران پڑا تھا۔ اتنی صبح سوائے رینجرز اور صفائی کرنے والے عملے کے کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان لوگوں نے گھر سے بنا کر لائے ہوئے اشتہار کی کاپیاں ان تمام جگہوں پر لگائیں جہاں جہاں اس پر نظمیں لکھ کر اس کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ اشتہار سب کی باہمی مشاورت سے تیار ہوا تھا۔

''اطلاع عام

ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ماہنامہ سندیسہ کے جولائی کے شمارے میں شہزادی فلک ناز اپنی علمی، ادبی اور اعلیٰ ترین تخلیق کے ساتھ جلوہ افروز ہو چکی ہیں۔ پہلے آیئے پہلے پایئے کی بنیاد پر اپنا پرچہ آج ہی حاصل کیجئے۔ خود بھی پڑھیے اور شہزادی صاحبہ سے جلنے والوں کو بھی

پڑھوائیے۔ جلدی کیجئے اسٹاک محدود ہے۔

المشتہر:۔ محبان شہزادی فلک ناز

ڈیپارٹمنٹ میں اس اشتہار سے کھلبلی مچ گئی تھی۔ ان دو گروپوں کی تکرار اور جنگ و جدل سے سب ہی واقف تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو پہلے ہی ڈائجسٹ پڑھ چکے تھے اور جنہوں نے نہیں پڑھا تھا وہ اس اشتہار کو پڑھنے کے بعد رسالہ لینے دوڑے تھے۔

حیدر لوگوں کا ردعمل بڑا خلاف توقع تھا۔ ان لوگوں کے پاس آ کر ان سب نے باجماعت ہو کر کورس میں مبارک باد دی تھی۔ حیدر نے بڑا اپنائیت بھرا شکوہ کیا تھا۔

''اتنی خوشی کی خبر وہ بھی سوکھے منہ۔ کم سے کم آپ حیدر آباد سے ہم لوگوں کے لیے ربڑی ہی لے آتیں۔''

فلک سے ان لوگوں کا شریفانہ انداز ہضم نہیں ہو رہا تھا مگر مبارک باد تو اس نے بہر حال قبول کر ہی لی تھی۔ ان سب کو ہی اب شدت سے اگلے شمارے کا انتظار تھا۔ آخر اپنے مکمل ناول کے بارے میں لوگوں کی آرا بھی تو پڑھنی تھیں۔ بڑی مشکلوں سے جوں توں کر کے مہینہ گزرا اور ڈائجسٹ ہاتھ میں آیا تو وہ سب کی سب رسالے پر جھپٹ پڑیں۔

''سندیسہ کے نام سندیسے'' میں پہنچ کر ان لوگوں نے ایک ایک خط کو کئی کئی بار پڑھا مگر کسی ایک خط میں جو اس کے بارے میں رائے دی گئی ہو۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے پچھلے ماہ اس کی کہانی چھپی ہی نہیں تھی۔ اسے بے اختیار رونا آنے لگا، پہلے ایڈیٹر کے ظلم و ستم کا نشانہ بنی اور اب قارئین۔ وہ کس کس محاذ پر لڑے۔

''ارے یہ دیکھو، ہے نا تمہاری کہانی پر تبصرہ۔'' سعدیہ نے چیخ مار کر کہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر وہ ایک عدد خط دریافت کرنے میں کامیاب ہوئی تھی جس میں اس کی کہانی پر تبصرہ کچھ یوں کیا گیا تھا۔

''جولائی کا شمارہ اچھا تھا۔ تمام تحریریں جان دار تھیں۔ یہ شہزادی فلک ناز غالباً نئی رائٹر ہیں۔ ان کا ناول پڑھ کر دو گولی ڈسپرین پانی میں گھول کر کھائیں تو سر درد ٹھیک ہوا۔ انداز تحریر ایک دم بچکانہ اور امیچور محسوس ہوا۔ باجی آپ نئے لکھنے والوں میں صرف اچھا لکھنے والوں ہی کو جگہ دیا کیجئے۔ جس تحریر نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا وہ میری فیورٹ رائٹر نجیب النساء کے سلسلے وار ناول کی پچیسویں قسط تھی۔ کتنی خوبصورتی سے انہوں نے حوریہ اور خرمن کو ایک کروایا ہے۔ اتنی اچھی تحریر پر دل کرتا ہے نجیب آپی کے ہاتھ چوم لوں۔ نجیب آپی آپ اسی طرح ہمارے لیے اچھے ناول لکھتی رہیں، آپ کے بغیر تو رسالے میں رونق ہی محسوس نہیں ہوتی۔''

''یہ نورتن بانو ضرور میرے ہاتھوں ضائع ہوگی۔'' وہ بری طرح پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

''دوسروں پر تنقید کرنا اس دنیا کا سب سے آسان کام ہے۔ خود سے اگر کہا جائے کہ ''کلفٹن کی سیر'' پر ایک صفحے کا مضمون لکھ دو تو بغلیں جھانکنے لگیں گی۔'' ناجیہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

''اور یہ منحوس نجیب النساء اللہ کرے اس کے ہاتھ ہی ٹوٹ جائیں۔'' اس نے جاہل عورتوں کی طرح بلبلا کر بددعا دی تھی۔

''پتا نہیں مجھے کبھی بھی کوئی خوشی مکمل کیوں نہیں ملتی۔ پہلے کہانی نہ چھپنے کا غم تھا، اب اللہ اللہ کر کے چھپی ہے تو لوگوں کا ناروا سلوک میرا دل پارہ پارہ کر رہا ہے۔''

اس کے دشمن تو تھے ہی موقع کی تاک میں۔ ابھی کچھ ہی روز پہلے اسے کہانی چھپنے کی مبارک باد دے کر ان کے گھر آ کر باقاعدہ پھوپھی صاحب کے ہاتھوں کی بنی رس ملائی کھا کر جانے والے اگلے روز اس کی روتی شکل دیکھ کر گنگنائے تھے۔

''چٹھی ذرا شہزادی جی کے نام لکھ دو۔'' اور وہ زار زار روئی تھی۔

''ایسا کرتے ہیں ہم سب فلک کی کہانی پر تعریفی خط لکھ کر پوسٹ کرتے ہیں۔''

اس کی اگلی کہانی پوسٹ کرتے ہی یمینہ نے مشورہ دیا تھا۔ اس کا دیا مشورہ سب ہی کو بے حد پسند آیا تھا۔ یہ بات تو ان میں سے کسی کے بھی ذہن میں نہیں آئی تھی کہ تعریفی خطوط تو خود بھی لکھے جا سکتے ہیں۔ ابھی اگلی کہانی چھپی نہیں تھی اور وہ سب خط لکھنے بیٹھ گئی تھیں۔ ایک ایک خط تو سب نے اپنے اصل نام و پتے سے لکھا باقی خطوط فرضی ناموں اور جگہوں سے لکھے گئے۔ خطوط میں لکھا جانے والا مواد تو ظاہر ہے سب کو رائٹر صاحبہ نے تیار کر کے دیا تھا۔ ہر خط میں ''اتنی اچھی تحریر پر شہزادی آپی کے ہاتھ چومنے کا دل چاہ رہا ہے۔'' شامل تھا۔ اس کے علاوہ نجیب النساء اور نورتن بانو کی بھی خوب کھنچائی کی گئی تھی۔

''آپ لوگوں کا کیا خیال ہے ایڈیٹر صاحبہ نے فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری کیا چنے دے کر حاصل کی ہے۔''

کمپیوٹر پر اپنا اسائنمنٹ ٹائپ کرتی افشاں نے وہیں بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر ان لوگوں کو مخاطب کیا تھا۔

''کیا مطلب؟'' وہ سب سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھیں۔

''مطلب یہ کہ اتنے بڑے ڈائجسٹ کی ایڈیٹر کوئی ہماری آپ کی طرح عام سی ذہانت رکھنے والی شخصیت نہیں ہو سکتی۔ دن بھر میں کتنی تحریریں ان کی نظروں کے سامنے سے گزرتی ہوں گی۔ ان کی ذہانت کا تو وہ حال ہوگا کہ خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔ ان تمام خطوط میں الفاظ کی ذرا سی الٹ پھیر کے ساتھ تقریباً ایک جیسی باتیں لکھی گئی ہیں اور انداز تحریر تو ظاہر ہے ایک سا ہے ہی۔ عقل کا مقابلہ عقل سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ بے وقوفانہ حرکتیں کر کے نہیں۔ نورتن بانو کو بھی لتاڑیں اور نجیب النساء کے بھی بخیے ادھیڑیں مگر ذہانت سے۔ ہر خط دوسرے خط سے مختلف ہونا چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ سب اپنے اپنے خط خود لکھیں۔ جو جس کے دل میں آئے وہی لکھے اور خیال رہے سارا کام بہت چالاکی سے کرنا ہے۔ باقی رسالے پر بھی تبصرہ کریں۔ سرورق، شاعری، پکوان اور انٹرویوز کے بارے میں رائے لکھیں تا کہ انہیں شک نہ ہو۔''

وہ کمپیوٹر کے سامنے سے اٹھ آئی تھی اور اب ان لوگوں کے پاس ہی کارپٹ پر رکھے فلور کشن پر چڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔ پھر ان لوگوں کے سامنے مثال پیش کرنے کے لیے افشاں ہی نے ایک خط لکھا تھا جس کا مضمون کچھ یوں تھا۔

''ستمبر کا شمارہ حسب سابق اے ون تھا۔ سرورق پر براجمان ماڈل البتہ ہمیں کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ اس کے سوٹ کا پرنٹ پردوں کا تھان لگ رہا تھا۔ آج کل یا سرو حید کے ڈیزائنر بہت ان ہیں۔ اگلے ماہ کے ٹائٹل پر ماڈل کا ڈریس اسی ڈیزائن کردہ آئس کریم کلرز والا ہونا چاہیے۔

فہرست پر نظریں دوڑائیں تو اپنی تمام ہی پسندیدہ مصنفات کے نام دیکھ دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ خاص طور پر شہزادی فلک ناز کا ناولٹ تو رسالے کی جان تھا۔ شہزادی صاحبہ کا منجھا ہوا انداز اور جملوں کی روانی اور برجستگی دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا کہ وہ نئی رائٹر ہیں۔ شہزادی آپی! آپ نورتن بانو ٹائپ لوگوں کی ہرگز پرواہ نہ کریں۔ میں اور مجھ جیسے لاکھوں قارئین آپ کی تحریروں کے دیوانے ہیں۔ دسترخوان میں تمام ڈشز اچھی تھیں۔ چیکو کی کھیر تو خاص طور پر مجھے بہت پسند آئی۔ باقی تمام افسانے اور ناول زبردست تھے۔ سوائے نجیب النساء کے ناول "ساحل کی ہوا" کے۔ لگتا ہے وہ اپنے ناول کی تھیم کو نباہ نہیں پا رہیں اور حوریہ کے پاس کیا بہت فالتو خون آ گیا جو بات بات پر لال ٹماٹر اور سرخ انار ہو جاتی ہے۔ اس سے کہیں کہ جا کر فاطمید میں تھوڑا سا خون عطیہ دے آئے۔"

افشاں کا مشورہ ان سب کے ہی دل کو لگا تھا اور پھر سب ہی نے اپنے اپنے انداز میں خطوط لکھے تھے۔ افشاں صاحبہ پر آج بہن کی محبت کا بھوت سوار تھا۔ اس لیے اس نے مزید کئی اچھے مشورے دیئے جنہیں سب نے بے حد سراہا تھا۔ پانچ خطوط اس کی دوستوں کے، ایک ناجیہ اور ایک افشاں کا اس کے علاوہ چار خطوط ثمینہ کی بہنوں کے، تین خطوط افرحہ کی امی اور بھابیوں کے، چھ خطوط عروس کی ماما اور بہنوں کے، ایک خط سعدیہ کی ممی کا اور چار خطوط فاطمہ کی کزنز کے۔ یعنی یہ کل ملا کر پچیس خطوط تو یہ ہو گئے تھے۔ مزید اس نے ایک ایک خط پھوپھی صاحب، مما، بھابھی اور اسماء سے بھی لکھوا لیا تھا۔

افشاں صاحبہ کا مشورہ یہ تھا تمام خطوط کراچی سے نہ پوسٹ کیے جائیں۔ ڈائجسٹ والے یقیناً تمام شہروں کی نمائندگی کا خیال رکھتے ہوں گے چنانچہ اس کی دوستوں کے اصلی ناموں والے خطوط کراچی سے پوسٹ کیے گئے۔ باقی خطوط میں سے آدھے اس نے بھائی میاں کے پاس رحیم یار خان پوسٹ کر دیئے تھے۔ بھابھی کو وہ فون پر سب کچھ بتا چکی تھی۔ انہوں نے وہ خطوط رحیم یار خان کے مختلف فرضی پتے ڈال کر ماہنامہ سندیسہ کے نام پوسٹ کر دیئے تھے۔ بقیہ خطوط اس نے فاروق کی بے پناہ منتیں کر کے اسے حیدر آباد اور ٹھٹھہ سے پوسٹ کرنے کو کہے تھے۔ حالانکہ وہ ٹھٹھہ اپنے ذاتی کام سے جا رہا تھا۔ پھر بھی اس نے تین سو روپے رشوت لی تھی۔ افشاں کا خیال تھا کہ گئے سے گئے ان میں سے دو تین خط تو شائع ہو ہی جائیں گے اور اس کے لیے یہ بھی غنیمت تھا۔

افشاں کا مشورہ واقعی کارگر ثابت ہوا تھا۔ ان لوگوں کے بھیجے گئے خطوط میں سے چار خط شائع ہو گئے تھے مگر کافی زیادہ سنسر کر کے۔ خصوصاً نجیب النساء کی شان میں کہے گئے ان لوگوں کے تبصروں کو تو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا تھا۔

اب تو وہ بڑے آرام سے مشہور مشہور رائٹرز کی تھیمز بھی چرانے لگی تھی۔ انگلش لٹریچر کی شامت تو آئی ہی تھی مگر اردو ادب پر بھی اس نے کافی سے زیادہ نظر کرم کی تھی۔ بانو قدسیہ، امرتا پریتم، قرۃ العین حیدر وہ ان سب کو اتنے دھڑلے سے کاپی کرتی تھی کہ اچھے اچھے اس کی ذہانت کے قائل ہو گئے تھے۔ کبھی کسی کی کہانی کا مرکزی خیال چرا لیتی، کبھی صرف دو چار سچویشنز اور پھر اسے اپنے انداز میں بڑی خوبصورتی سے انجام تک پہنچایا کرتی تھی۔ وہ اس فن میں اتنی ماہر ہو چکی تھی کہ کوئی اس پر نقالی کا الزام بھی نہیں لگا سکتا تھا۔

مگر اس سب کے باوجود پڑھنے والے ابھی تک اسے ایک رائٹر کی حیثیت سے تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوئے تھے یا تو خطوط میں سرے سے اس کا ذکر ہی نہ ہوتا اور اگر ہوتا بھی تو برائیوں میں ڈوبا ہوا۔ فاروق وغیرہ کا خیال تھا کہ جس روز وہ یہاں وہاں سے کہانیاں چرانا چھوڑ کر خود لکھنا

شروع کر دے گی اسی روز لوگ بھی اسے تسلیم کرلیں گے۔

پھر اس روز ایسا واقعہ ہوا کہ وہ کہانی چرائے بغیر اپنے بل بوتے پر لکھنے میں کامیاب ہوگئی۔ ہوا دراصل یہ تھا کہ اس روز پھوپھی صاحب نے رات کے کھانے میں آلو پھلی پکائی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر اس کی نظر سامنے رکھے آلو پھلی کے ڈونگے پر پڑی تو اس کا منہ بن گیا تھا۔

''پھوپھی صاحب! آپ ہم لوگوں سے کون سے جنم کا بدلہ لے رہی ہیں۔''

وہ بڑے دکھی دل سے پوچھ رہی تھی۔ پھوپھی صاحب نے اسے گھور کر دیکھا تھا، کھانے پینے کے معاملے میں نخرے انہیں بالکل پسند نہ تھے۔

''اللہ سے توبہ کرو، پیٹ بھر کر کھانے کو مل رہا ہے تو نخرے سوجھ رہے ہیں، ان سے پوچھو بے چارے کئی کئی وقت کے بھوکے ہوں گے۔ خدا کی نعمت کو دیکھ کر منہ بنا رہی ہو۔ اللہ کا شکر ادا کرو جو اچھا کھلا رہا ہے، پہنا رہا ہے۔''

وہ ہمیشہ کی طرح اس بات پر ناراض ہوئی تھیں۔ افشاں تو کھانے پینے کی زیادہ شوقین تھی ہی نہیں اور ناجیہ بیگم آج کل ڈائٹنگ کر رہی تھیں اس لیے ان دونوں ہی کو اس ڈش پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

''خدا کی نعمت کو کون برا کہہ رہا ہے۔ خدا کی نعمت کڑوے تیل میں پکی آلو پھلی تو نہیں ہے۔ آلو ایک الگ نعمت ہے، پھلی ایک الگ نعمت ہے اور پیاز اور سرسوں کا تیل بھی الگ الگ نعمتیں ہیں، مجھے اعتراض تو ان کے باہم اشتراک پر ہے۔ ان سب نعمتوں کو الگ الگ بھی تو پکایا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ آلوؤں کے پراٹھے بنائے جا سکتے ہیں، قیمہ یا مرغی بھر کر کٹلس بنائے جا سکتے ہیں، بھرتہ بن سکتا ہے، چاول ڈال کر طاہری بنائی جا سکتی ہے اور پھلیوں کو پاستا میں ڈالا جا سکتا ہے، اسپگیٹیز میں ڈال سکتے ہیں، پیزا میں استعمال کر سکتے ہیں، سبزیوں کے سوپ میں ڈال سکتے ہیں اور سرسوں کے تیل کو نہانے سے تین گھنٹہ پہلے بالوں میں لگا کر بالوں کو صحت مند اور چمک دار بنایا جا سکتا ہے اور اگر کھانے پینے کی چیزوں میں اس کا استعمال اتنا ہی ضروری ہے تو اس میں پکوڑے تلے جا سکتے ہیں، بڑے تلے جا سکتے ہیں یعنی یہ کہ میں نے کسی نعمت کو برا نہیں کہا۔ اللہ تعالیٰ نے تو سبزیاں پیدا کی ہیں اب کس کو کس کے ساتھ ملا کر پکانا ہے یہ ہمارا اپنا ڈیسیشن ہوگا اور آلو پھلی سے زیادہ بکواس اس دنیا میں سبزیوں کا کوئی Combination نہیں ہو سکتا۔'' وہ مقررانہ انداز میں بڑے جوش و خروش سے بول کر خاموش ہوئی تو افشاں اور ناجیہ سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ روکنے کی کوشش کرتی نظر آئیں جبکہ پھوپھی صاحب خشمگیں نگاہوں سے اسے گھور رہی تھیں۔

''تمہیں کھانا ہے تو کھاؤ، میرا دماغ مت خراب کرو۔ ایک تو اتنی بڑی بڑی لڑکیوں کے لیے پکا کر رکھتی ہوں اس پر بھی مزاج نہیں ملتے۔''

وہ نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے دوٹوک انداز میں بولیں تو اسے پھوپھی صاحب کی ظالم و جابر شخصیت ہمیشہ سے زیادہ بری لگی۔

''دکھا دیا نا آپ نے فرق پھوپھی صاحب! اپنی بیٹی کو تو شام کی چائے کے ساتھ تلوں والی میٹھی روٹی بنا کر دی تھی اور ہم ماں باپ سے دور مجبور بہنیں یہاں آپ کے ظلم و ستم سہہ رہی ہیں۔ چلو افشاں! اب ہم یہاں نہیں رہیں گے، مما ٹھیک کہتی ہیں پھوپھی صاحب سو فیصد دادی پر گئی ہیں۔ چلو میری بہن! یہ ظالم دنیا والے ہمیں جینے نہیں دیں گے۔''

اس بھری دنیا میں کوئی بھی ہمارا نہ ہوا

غیر تو غیر سہی اپنوں کا بھی سہارا نہ ہوا

وہ دکھ بھرے انداز میں گاتی افشاں کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے لگی تھی جبکہ پھوپھی صاحب اس اداکاری سے متاثر ہونے کے موڈ میں قطعی نہیں تھیں۔ ناجیہ کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا تھا۔ پھوپھی صاحب نے سلاد کا ڈونگا ناجیہ اور افشاں کی طرف کھسکا کر اسے تقریباً نو لفٹ کروادی تھی۔

غیروں پہ کرم اپنوں پہ ستم

اے جانِ وفا یہ ظلم نہ کر

وہ غمزدہ انداز میں گاتی ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ گئی تھی۔ کسی نے بھی اسے روکنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ کھانا نہ کھا کر اکڑ تو دکھا دی تھی مگر اب پیٹ میں چوہوں کی عالمی ریس اسے بے حال کر رہی تھی۔ سب کے سونے کے بعد وہ اٹھ کر چپکے سے کچن میں آگئی اور فریج کھول کر اندر جھانکا۔ پہلے ارادہ تھا کہ انڈا فرائی کرے گی مگر انڈوں کا خالی خانہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ پھر سوچا کہ ڈبل روٹی پر پنیر لگا کر سینڈوچ بنا لیتی ہوں۔ دیکھا تو ڈبل روٹی نہیں تھی۔ ''گھر کھیر تو باہر کھیر'' کا مطلب اسے پہلی مرتبہ بالکل صحیح سے سمجھ آ گیا تھا۔

کل جب پھوپھی صاحب نے چکن بریانی بنائی تھی تو برابر والی آنٹی گرما گرم پیزا کی ٹرے اٹھائے چلی آئی تھیں۔ ''پیزا بیک کیا تھا میں نے سوچا تھوڑا سا بچیوں کے لیے لے جاؤں۔''

وہ بڑے پیار سے گویا ہوئی تھیں اور آج جب بچی بھوک سے نڈھال بیٹھی تھی تو وہاں سے کچھ نہ آیا تھا۔ اسے فریج سے انڈوں اور ڈبل روٹی کے غائب ہونے میں سو فیصد پھوپھی صاحب کی چال نظر آ رہی تھی۔ فریج میں سوائے پانی کی بوتلوں، چیز، مکھن اور آلو چھلیوں کے اور کچھ نہ رکھا تھا۔

''انہیں بھی بڑے اہتمام سے فریج میں رکھا ہے، ارے ایسی چیزیں تو باہر بھی چھوڑ دی جائیں تب بھی خراب نہیں ہوتیں۔''

وہ آلو چھلیوں کو سوکنوں والی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ کتنے اہتمام سے آج اس نے لکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ قراۃ العین حیدر کے ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں سے اس نے بعض چیزیں چرا کر ایک کہانی لکھنے کا پلان بنایا تھا۔ خالی پیٹ کیا خاک لکھا جاتا۔ چیونگم اور کیڈبریز سے تو پیٹ بھر نہیں سکتا تھا۔ پھر آم کے اچار کی پھانکیں کھاتے اور پیپسی کے کین میں سے ایک ایک گھونٹ پیپسی پیتے ہوئے اسے بے اختیار شفیق الرحمان یاد آگئے۔

''سر! آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا، دنیا کا سارا اچھا ادب غم کی پیداوار ہے۔''

اس نے شفیق الرحمان کی روح کو مخاطب کیا تھا، پھر اپنے محسن کے ہی انداز میں وہ ''یا غم تیرا آسرا'' کہتی ہوئی کھڑی ہوئی تھی۔ کمرے میں آ کر قلم اور کاغذ سنبھال کر وہ شروع ہو چکی تھی۔ افشاں خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی تھی اور اس کا غم اس سے دنیائے ادب کی شاہکار تحریر تخلیق کروا رہا تھا۔ اپنی تحریر کا آغاز ہی اس نے شعر سے کیا تھا۔

اس کے دل پر بھی کڑی، سبزیاں کھانے میں گزری ہوگی

نام جس نے بھی آلو چھلیوں کا مویشیوں کا چارہ رکھا ہوگا

پھوپھی صاحب تہجد کی نماز کے لیے اٹھیں تو وہ بیڈ پر اوندھی لیٹی دھڑا دھڑ صفحے سیاہ کر رہی تھی۔ اپنا دردِ دل صفحہ قرطاس پر منتقل کرتی وہ گردوپیش سے بے نیاز تھی۔ انہیں تو خیر اس پر کیا رحم آنا تھا، الثارات بھر جاگنے پر انہوں نے ڈھیر ساری صلواتیں سنائی تھیں۔

خطوط کے معاملے میں تو ابھی تک اس کی دوست بڑی وفاداری کے ساتھ نباہ رہی تھیں۔ اس کی اس بہترین ''تخلیق'' پر بھی اس کی فرینڈز تعریفی خطوط روانہ کر چکی تھیں مگر کہانی چھپنے کے اگلے ماہ جب ڈائجسٹ ہاتھ میں آیا تو اس کی دوستوں کے خطوط میں سے تو ایک خط شامل تھا ہی مگر ایک خط اور بھی تھا، جس میں اس کی تحریر کی تعریف کی گئی تھی۔ یہ اس کی پہلی تعریف تھی جو کسی نے خود ہی کر دی تھی اس لیے وہ بے خود ہو رہی تھی۔ خط میں اس کی کہانی کے علاوہ کسی اور کہانی پر کوئی تبصرہ نہیں کیا گیا تھا۔

''شہزادی فلک ناز کی تحریر کو اگر اس سال کی بہترین تحریر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، خصوصاً ان کی کہانی کا آخری پیراگراف تو اچھوں کو رلوا گیا۔ خاص طور پر اختتامی شعر

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

ان کی کہانی کا مرکزی خیال یعنی آلو چھلی بے حد جاندار تھا۔ کس طرح آلو چھلیاں ایک انسان کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہیں انہوں نے ان تمام پہلوؤں کا نہایت عمدگی سے تجزیہ کیا۔ پڑھنے والے شاید اسے ایک مزاحیہ تحریر سمجھیں مگر ہم تو اسے ایک دکھی دل کی فریاد سمجھیں گے۔ آپ سے ہماری مؤدبانہ گزارش ہے کہ جس طرح آپ کے ماہنامہ کا خاص نمبر، سالگرہ نمبر، بہار نمبر اور سال نو نمبر نکلتا ہے بالکل اسی طرح ایک ''سبزی نمبر'' بھی نکالیں اور اس نمبر میں تمام چوٹی کی مصنفات کو سبزیوں سے متعلق اپنے اپنے تجربات بیان کرنے کی دعوت دیں اور شہزادی فلک ناز اس میں بطور خاص ایک مکمل ناول بینگنوں کے بارے میں لکھیں۔ کب ایک انسان کا دل اس دنیا سے اچاٹ ہو جاتا ہے، اچھا بھلا آدمی خودکشی کے مختلف آسان طریقوں کے بارے میں کیوں غور کرنے لگتا ہے، ان تمام باتوں کا وہ اس ناول میں احاطہ کریں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گی۔''

خط کا مضمون گو تعریفی تھا مگر انداز بڑا عجیب و غریب سا تھا۔ ان لوگوں نے بھیجنے والے کا نام دیکھا تو وہاں متاثرین بینگن مہران انجینئرنگ یونیورسٹی جامشورو لکھا ہوا تھا۔ رسالے کی ایڈیٹر نے اس خط کا بطور خاص جواب دیا تھا۔

''متاثرینِ بینگن ہم ''سبزی نمبر'' نکالنے کے لیے تیار ہیں اگر آپ وعدہ کریں کہ اس میں اپنے خط ہی کی طرح ایک شوخ و شریری تحریر ہمیں بھیجیں گے۔ آپ کا اندازِ تحریر شوخ، برجستہ اور بے حد سلیس و رواں ہے۔ آپ میں بلاشبہ افسانہ نگاری کی قدرتی صلاحیت موجود ہے۔''

خط کا جواب پڑھ کر اس کی دوست تو نارمل تھیں مگر خود فلک کو سخت غصہ آ رہا تھا۔

''مجھے تو آج تک کبھی باقاعدہ لکھنے کی دعوت نہیں دی، میں خود ہی بے شرموں کی طرح اپنی کہانیاں بھیجتی رہتی ہوں اور یہ متاثرین بینگن میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں۔'' وہ بری طرح جیلس ہو رہی تھی۔

شام میں فاروق کا فون آیا تو وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''دیکھ لو مائی ڈیر سس! مجھے اور میرے تینوں دوستوں کو تمہارے ڈائجسٹ میں لکھنے کی آفر مل گئی۔''

اس اپنی عقل پر افسوس ہوا کہ مہران انجینئرنگ یونیورسٹی پڑھ کر بھی اس کا دھیان فاروق اور خرم وغیرہ کی طرف نہیں گیا تھا۔

''صرف ایک خط پر میری یہ آؤ بھگت اور پذیرائی، اگر جو میں کہانیاں لکھنی شروع کر دوں تو تم جیسے نقالوں کی تو کھڑے کھڑے چھٹی ہو جائے گی۔''

وہ اتراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ناجیہ اور افشاں سمیت اس کی تمام فرینڈز بھی فاروق کی اس حرکت کو انجوائے کر رہی تھیں۔ سب کا خیال تھا کہ اس کا بھائی ایک زندہ دل نوجوان ہے۔

ان لوگوں کے ماسٹرز مکمل ہونے میں صرف ایک سمسٹر کی دوری رہ گئی تھی۔ جب اچانک ہی ناجیہ کی شادی کا ایشو اٹھا۔ منگنی تو اس کی میٹرک کرتے ہی ان لوگوں کے مشترکہ کزن ظہیر کے ساتھ ہو چکی تھی۔ ظہیر بھی بھائی میاں کی طرح آرمی میں ڈاکٹر تھا اور آج کل اس کی پوسٹنگ ان ہی کے ساتھ رحیم یار خان میں تھی۔ پھوپھی صاحب دورانِ تعلیم شادی کے حق میں نہیں تھیں مگر اس کی ساس کو اچانک ہی یہ وہم ہونا شروع ہو گیا تھا کہ اب وہ اس دنیا میں کچھ ہی عرصے کی مہمان ہیں۔ پھوپھی صاحب کے برخلاف ناجیہ بڑی مطمئن تھی۔

''یار تمہارا ماسٹرز نامکمل رہ جائے گا۔ پتا نہیں بعد میں وہ لوگ تمہیں پڑھنے دیں کہ نہ پڑھنے دیں۔'' اس نے ہمدردی سے کہا تھا۔

''تو کیا ہوا، نہیں پڑھنے دیں گے تو نہ پڑھنے دیں، آنرز بھی کوئی معمولی تعلیم نہیں اور انگلش لٹریچر میں ایم اے کر کے بھی کون سا تیر مارلوں گی۔ زیادہ سے زیادہ کسی کالج میں لیکچرر لگ جاؤں گی بس۔ جب یہ طے ہے کہ لڑکی کے لیے سب سے امپورٹنٹ چیز شادی ہے تو بس پھر یہی ٹھیک ہے۔'' وہ بڑے آرام سے بول رہی تھی۔

''شوہروں کو بیویوں کی ڈگریز میں کچھ اتنا خاص انٹرسٹ نہیں ہوتا۔ کبھی تم نے کسی شوہر کو اس بات پر خوش ہوتے دیکھا ہے کہ میری بیوی رات کو سونے سے پہلے ورڈز ورتھ کی شاعری سناتی ہے اور اس کے منہ سے وہ پوئم سن کر میں فطرت کے حسن میں کھو جاتا ہوں، آن واحد میں میں خود کو اسکاٹ لینڈ کے کسی پر فضا مقام پر کھڑے ہو کر نیچر کی خوبصورتی میں کھویا پاتا ہوں یا پھر یہ کہ میری بیوی کو شیکسپیئر کے اکثر ڈراموں کے بہت سے ایکٹ منہ زبانی یاد ہیں، وہ کیٹس کی بہت بڑی فین ہے اور ہم دونوں شیکسپیئر کے ڈراموں اور کیٹس کی شاعری کا اصل لطف اٹھانے عنقریب اٹلی جا رہے ہیں۔ اس کے برخلاف تمہیں ایسے شوہروں کی کثیر تعداد نظر آئے گی جو دوستوں میں فخر سے اپنی بیوی کی ککنگ کی تعریف کرتے ہیں، اس کے سگھڑاپے کے گن گاتے ہیں۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بول رہی تھی۔

''ذہین اور پڑھی لکھی بیویاں اکثر بڑے بڑے قابل مردوں کو بھی اچھی نہیں لگتیں۔'' وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

ان دنوں وہ لوگ شادی کی شاپنگ کرنے میں مصروف تھیں۔ اس روز وہ پھوپھی صاحب اور ناجیہ جیولر کے پاس گئے ہوئے تھے۔ ناجیہ کی دیکھا دیکھی اس نے بھی وہیں بیٹھے بیٹھے گن سے ناک چھدوالی تھی مگر گھر آ کر جب پھوپھی صاحب نے اسے ناک میں نیم کا تنکا یا چاندی کی بالی ڈالنے کو کہا تو وہ بہت بدمزہ ہوئی۔

''کنواری لڑکیاں لونگ نہیں پہنتیں۔'' انہوں نے اس کے احتجاج کو یکسر رد کر دیا تھا۔

''یہ کیا بات ہوئی اب بندہ اپنے معصوم معصوم شوق پورے کرنے کے لیے بھی شادی کا انتظار کرے۔ ساڑھی نہیں پہن سکتے، ناک میں لونگ نہیں ڈال سکتے، یہ بھی کوئی زندگی ہے، بندہ اپنی خوشی سے کوئی کام بھی نہ کر پائے۔'' اسے ان فضول رسم ورواج پر سخت طیش آیا تھا مگر پھوپھی صاحب کو کون سمجھا سکتا تھا۔

''اپنی بیٹی کی تو اتنے پہلے سے منگنی بھی کر دی۔ بھتیجیوں کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں۔ پتا نہیں کون لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ پھوپھی بھتیجی ایک ذات۔''

اس نے دہائی دی تھی مگر وہ کب ان باتوں سے متاثر ہوتی تھیں۔ سکون سے کھڑی سالن میں ہری مرچیں اور ہرا دھنیا ڈالتی رہی تھیں۔

ناجیہ بیگم نے یونیورسٹی جانا چھوڑ کر صدر، بہادر آباد، کلفٹن اور طارق روڈ کے چکر کاٹنے شروع کر دیئے تھے۔ اس دن بھی وہ ناجیہ کے بغیر اکیلی ہی یونیورسٹی سے گھر واپس آئی تو کمپاؤنڈ میں امیر حمزہ سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے خندہ پیشانی سے سلام کیا تو فلک جواب دیتے ہوئے بولی۔

''خیریت، آج یونیورسٹی نہیں آئے۔''

''کچھ انفلوئنزا کے اثرات محسوس ہو رہے تھے اس لیے سوچا ریسٹ کر لوں۔'' وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بولا۔

''وہ فلک! مجھے تم سے ایک بات کرنی تھی۔'' وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولا۔ اس نے حیرت سے حمزہ کو دیکھا، امیر حمزہ اور کوئی بات کہنے میں ہچکچائے، اسے تعجب ہوا تھا۔

''انفیکٹ میں بہت دنوں سے تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا مگر تم اکیلے میں ملتی ہی نہیں تھیں۔'' وہ کچھ کنفیوژ سا لگ رہا تھا۔ اس کے اسٹائل پر حیران ہوتی فلک کے ذہن میں عجیب عجیب سی باتیں آنے لگیں۔ خاص طور افرحہ اور یمینہ نے ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی امیر حمزہ کے بارے میں جو کمنٹس دیئے تھے وہ اسے ایک دم یاد آ گئے تھے۔

''وہ اصل میں بات یہ ہے کہ۔'' وہ کہتے کہتے پھر چپ ہو گیا تھا۔

فلک سوالیہ شکل بنائے بنائے تھک چکی تھی اس لیے تنگ آ کر جھلاّئے ہوئے انداز میں بولی۔

''حمزہ! جو بھی بات ہے جلدی بولو، مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے اور میں۔''

''وہ اصل میں بات یہ ہے کہ......''

''مزید برداشت نہیں کر سکتی۔'' سچی بات تو یہ تھی کہ اس کے دل میں بری طرح کھدبد مچی ہوئی تھی۔ آخر ایسی کیا بات ہے جو امیر حمزہ جیسا آؤٹ اسپوکن شخص ہچکچا رہا ہے۔

''تمہیں ناک میں لونگ پہننے کا بہت شوق ہے، اس کے علاوہ شاید ساڑھی پہننے کا بھی۔ ہے نا؟''

وہ سوالیہ انداز میں مخاطب ہوا تھا۔ فلک ٹھٹھک کر ایک دم رک گئی تھی۔ کل ہی تو وہ لفٹ سے نکل کر اپنے فلیٹ کے اندر گھسنے تک اسی مسئلے پر

پھوپھی صاحب سے تفصیلی بحث کر رہی تھی اور اس گفتگو یا اس کا کچھ حصہ شاید اس نے بھی سن لیا تھا۔

''اگر میں کہوں کہ تمہارا یہ شوق پورا ہو سکتا ہے، اگر تم چاہو تو'' وہ بڑی ہمت کر کے بولا تھا۔

''مطلب کیا ہے تمہارا؟'' وہ زبردستی خود کو انجان ظاہر کرتے ہوئے اکڑ کر بولی تھی۔

''یار! وہ میرے بھیا ہیں نا یقین کرو بہت اچھے ہیں۔ بس صرف دو مسئلے ہیں ایک تو یہ کہ ان کی ہائٹ پانچ فٹ دس انچ ہے لیکن یار دو انچ کی چھوٹائی بڑائی سے کیا فرق پڑتا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ انکم ٹیکس میں جاب کرتے ہیں لیکن بائی گاڈ! میرے بھیا بہت ایماندار ہیں انہوں نے آج تک رشوت کا ایک بھی پیسہ نہیں لیا۔ سی ایس ایس کے اگزیم میں ان کی تیسری پوزیشن آئی تھی۔ بالکل تمہارے ہیرو کی طرح جینئس ہیں اور شکل صورت میں مجھ سے بھی زیادہ گڈ لکنگ۔''

وہ بڑی عاجزی اور انکساری سے بولا تھا اور فلک جواب میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔ اپنی کچھ دیر پہلے کی سوچ پر اسے بری طرح ہنسی آ رہی تھی۔ حمزہ کے بات کرنے کا اسٹائل بھی بالکل ایسا تھا جیسے وہ ابھی اس سے اظہارِ عشق کرنے والا ہے۔

''کیا ہوا؟ تم ہنس کیوں رہی ہو'' وہ جو یہ سمجھ رہا تھا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے اس کے ہنسنے پر سخت متعجب تھا۔ ''کچھ نہیں، بس ویسے ہی۔'' وہ اپنی ہنسی کنٹرول کرتے ہوئے بولی۔ ''ہاں تم اپنے بھیا کا کیا ذکر کر رہے تھے۔''

اچانک اسے دھیان آیا کہ شاید امیر حمزہ نے اپنے بھیا کے متعلق کچھ کہا تھا اور وہ جو اسے ہنستا دیکھ کر قدرے پرسکون ہو چکا تھا بڑے اطمینان سے اپنی بات تفصیل سے بیان کرنے لگا۔

(اس کے ''چنگیزی'' اسٹائل سے تو اچھے اچھے پناہ مانگا کرتے تھے امیر حمزہ تو تھا کس کھیت کی مولی۔ اس لیے اس کا ڈرنا قانون فطرت کے عین مطابق تھا۔)

''یار! ہم لوگ اپنے بھیا کا رشتہ تمہارے لیے لانا چاہتے ہیں بس تمہاری رضامندی درکار ہے۔''

وہ بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کا خیال تھا کہ ابھی وہ دوپٹے کا کونا منہ میں دبائے ''مجھے نہیں پتا'' کہتی ہوئی شرما کر وہاں سے بھاگ جائے گی۔ اپنے بڑوں سے سنا تھا کہ بولڈ سے بولڈ لڑکی بھی ایسے موقعوں پر شرما جاتی ہے مگر یہاں مدمقابل اسے حیران کرنے کے درپے تھا۔

''ایسے بغیر دیکھے میں کیسے رضامندی دے دوں۔'' وہ بغیر حیران ہوئے سکون سے بولی تھی۔

''تم نے میرے بھیا کو دیکھا ہوا نہیں ہے، اکثر تو مجھ سے ملنے آتے رہتے ہیں۔''

وہ صدمے سے چور لہجے میں بولا تھا۔ بیچارے بھیا شروع شروع میں چھوٹے بھائی کی محبت میں اور پھر بعد میں کسی اور ہی ''چکر'' میں ہفتے میں پانچ پانچ چکر لگایا کرتے تھے اور وہ جس کے لیے موصوف اتنے کشٹ اٹھا رہے تھے، سرے سے انہیں جاننے اور پہچاننے سے ہی انکاری تھی۔'' اچھا میں ابھی اندر جا کر تمہیں ان کی تصویر دکھا دوں گا لیکن تم میری بات کا یقین کرو وہ واقعی بہت ہینڈسم ہیں۔ بس صرف تمہارے ہیرو کی طرح ''چھ فٹے'' نہیں ہیں اور نہ ہی انہیں بلقیس ایدھی نے پالا ہے یعنی خیر سے ان کے امی ابا اور چار عدد بہن بھائی بھی موجود ہیں۔ تم اپنی ہیروئن کی طرح لگی

نہیں ہو کہ چھڑا چھانٹ ہیرو مل جائے جس کا کوئی والی وارث بھی نہ ہو۔ اگر تم نے اس رشتے کے حق میں فیصلہ دے دیا تو تمہیں ایک عدد ساس کے ساتھ ساتھ تین عدد نندوں سے بھی واسطہ پڑے گا۔ علاوہ ازیں بھیا کے پاس نہ تو لیموزین ہے نہ مرسڈیز اور نہ ہی نئے ماڈل کی کوئی اسپورٹس کار بلکہ بے چارے ایک عدد ٹویوٹا رکھتے ہیں وہ بھی انیس سو اسی کے ماڈل کی اور سیکنڈ ہینڈ۔ تم خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرلو۔"

وہ اس کے چہرے کے تاثرات سے سمجھ چکا تھا کہ اسے اس بات پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں اس لیے اب اپنے مخصوص انداز میں بڑی سنجیدگی سے بولا تھا۔ فلک اس کی باتیں بڑی بے توجہی سے سنتی اپنی ہی کسی سوچ میں الجھی ہوئی تھی۔

"کیا شاندار آئیڈیا ہے، ہیروئن اور اس کی سہیلیوں کی اپنی کلاس کے سب سے ذہین گروپ سے ہر وقت ٹھنی رہتی ہے۔ دونوں گروپس ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔ ہیروئن کو مخالف گروپ کا ایک ممبر ضرورت سے زیادہ ہی تنگ کرتا ہے، ہر وقت اسے چھیڑتا اور اس کا مذاق اڑاتا ہے، پڑھنے والے سمجھنے لگتے ہیں کہ اسی تکرار میں کہیں نہ کہیں پیار بھی چھپا ہوا ہے مگر یہیں پر وہ رائٹر کی چالاکی کے آگے ہار جاتے ہیں، ہیرو تو اسے اپنی بھابھی کے طور پر پسند کر رہا ہوتا ہے کیونکہ اس کے بھیا چپکے چپکے ہیروئن کی محبت میں عرصہ دراز میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھر لاسٹ سین میں جب پڑھنے والے سمجھتے ہیں کہ بس اب ہیرو ہیروئن سے اظہار محبت کر دے گا۔ اس وقت رائٹر بڑے ڈرامائی انداز میں پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیتی ہے اور پڑھنے والے اچانک خود کو انتہا درجے کا احمق اور الو محسوس کرتے ہیں۔ بھئی واہ کیا شاندار اسٹوری ہے۔ سسپنس، ڈرامہ، تھرل سارے لوازمات موجود ہیں۔ واہ واہ کیا شاندار تھیم ہے۔ ہیرو کا بھائی ہیروئن پر عاشق۔ زبردست۔"

آخری جملہ وہ با آواز بلند بولی تھی اور امیر حمزہ حیران آئینہ وار ہیں ہم کی عملی تفسیر بنا کھڑا اسے تک رہا تھا۔ اسے خود ہی اپنی بے خودی اور اس کے گھورنے کا احساس ہوا تو فوراً بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے، بھیج دو اپنے ممی پپا کو، مجھے ذرا جلدی ہے پھر بعد میں تفصیل سے بات کریں گے۔" کہنے کے ساتھ ہی وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی تھی۔ اچھا ادب ایسے ہی تخلیق نہیں ہو جاتا، رائٹر کو ادب کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنانا پڑتا ہے تب کہیں جا کر کوئی شاہکار تخلیق ہوتا ہے۔ اسے ابھی فوراً جا کر اس نئے آئیڈیے پر اپنی تازہ ترین کہانی شروع کرنی تھی اور پیچھے کھڑا امیر حمزہ تیز تیز لفٹ کی طرف قدم بڑھاتی اس لڑکی کو کچھ حیرت اور کچھ پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا مختلف ہونا ہی تو اسے اور اس کے بھیا دونوں کو پسند آیا تھا۔

❀......❀